سعادت حسن منٹو
عصرِ حاضر کے آئینے میں
مُرتّب:
محمد حُسین پرکار
अ ا
ہندستانی پرچار سبھا

احوالِ مرتّب

خاندانی نام: محمد حسین قاضی عبدالرحمٰن پرکار

تولید: ۱۰رمئی ۱۹۳۸ء، مولد: بانکوٹ، ضلع رتنا گیری

تعلیم: ایم اے بی ایڈ پی جی ڈپلومہ (ایڈلٹ ایجوکیشن، مانچسٹر)

پیشہ: درس وتدریس

پتہ: ۲۰۴، اے، سمراٹ اپارٹمنٹ، فادر پیٹر پریرا روڈ، (سوناپور لین) آف لال بہادر شاستری مارگ، کرلا (ویسٹ)، ممبئی ۴۰۰۰۷۰۔ فون: 022-25040757

تصانیف: (۱) اُردو ادب اور گاندھیائی افکار (۲) باقی نشان ہمارا (قومی یکجہتی پر مبنی کہانیاں)، (۳) دریچہ (مراٹھی تخلیقات کے اُردو تراجم)، (۴) بجلی نے کہا دھرتی سے (مراٹھی سے ترجمہ)، عکس (مراٹھی خاکوں کا ترجمہ)، (۶) پریم چند: ہندی جہتیں (مرتبہ)

محمد حسین پرکار صاحب نے اُردو اسکول بانکوٹ میں پرائمری تعلیم حاصل کی اور نیشنل ہائی اسکول داپولی میں ثانوی تعلیم حاصل کی۔ اُس کے بعد آپ نے اسمٰعیل یوسف کالج، جوگیشوری سے ایم اے اور ایس ٹی کالج ممبئی سے بی ایڈ کی ڈگری حاصل کی۔ آپ نے مانچسٹر یونیورسٹی سے پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما ان ایڈلٹ ایجوکیشن حاصل کیا۔ محمد حسین پرکار صاحب نے باندرہ اُردو ہائی اسکول میں بحیثیت ٹیچر ملازمت اختیار کی۔ اُس کے بعد بُرہانی کالج اور سومیا کالج میں لکچرر کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے۔ میونسپل کارپوریشن ممبئی کے محکمہ تعلیم کے ایل ڈی پی شعبہ میں صدر شعبہ اُردو اور مُشیر کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے اور اب مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر اور لائبریری (ہندستانی پرچار سبھا) ممبئی میں ریسرچ آفیسر (اردو) کے عہدے پر فائز ہیں۔

محمد حسین پرکار صاحب شہر ممبئی کے متعدد فلاحی اور تعلیمی اداروں سے منسلک رہ کر سماجی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آپ غیر اردو داں طبقہ میں پچھلی تین دہائیوں سے اردو پڑھانے کا عظیم کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔ آپ اردو کی شیرینی اور حلاوت غیر اردو داں حلقوں تک پہنچانے والے اوّلین لوگوں میں سے ایک ہیں۔ آپ کو مراٹھی اور اردو زبانوں میں قدرت حاصل ہے۔ آپ نے اردو سے مراٹھی اور مراٹھی سے اردو میں قابل قدر ترجمے کئے ہیں۔ آپ ہندستانی پرچار سبھا کے تحقیقی رسالے ''ہندستانی زبان'' کے جوائنٹ ایڈیٹر ہیں۔ آپ کی ادبی خدمات کافی وسیع ہیں۔ آپ کی ادبی اور سماجی خدمات اور اردو اور مراٹھی زبان کے ادب کو ہم آہنگ کرنے کی نمایاں کوششوں کے اعتراف میں امریکہ کے ایک معروف ادارے بایوگرافیکل انسٹی ٹیوٹ نے ''مین آف دی ایر ۲۰۰۳ء'' کے اعزاز سے آپ کو سرفراز کیا ہے۔ ۲۰۱۱ء میں مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی نے انہیں 'عکس' (مراٹھی خاکوں کا ترجمہ) پر ایوارڈ سے نوازا ہے۔

☆☆☆

سعادت حسن منٹو

عصرِ حاضر کے آئینے میں

مُرتّب:

محمد حُسین پرکار

ہندُستانی پرچار سبھا

جملہ حقوق : ہندستانی پرچار سبھا

کتاب : سعادت حسن منٹو، عصرِ حاضر کے آئینے میں

مرتب : محمد حُسین پرکار (ریسرچ آفیسر، اُردو)

پبلشر : فیروز این پیچ (اعزازی سکریٹری)

ہندستانی پرچار سبھا، مہاتما گاندھی میموریل بلڈنگ، 7۔ نیتاجی سبھاش روڈ، ممبئی 400002

فون: 22812871,22810126، ای میل: hp.sabha@gmail.com

پہلا ایڈیشن : جنوری 2013ء

قیمت : -/150 روپے

زیر اہتمام : ایڈشاٹ پبلی کیشنز ممبئی 09987025932, athar_adshot@yahoo.co.in

SAADAT HASAN MANTO - Asre Haazir kay Aaine Mein

Compiled by : Mohammed Husain Parkar

Publisher : Firoze N. Patch (Hon. Secretary)
Hindustani Prachar Sabha
Mahatma Gandhi Memorial Building,
7-Netaji Subhash Road, Mumbai-400 002
22812871,22810126, email:hp.sabha@gmail.com

Coordinated by : Adshot Publications, 09987025932, athar_adshot@yahoo.co.in

Price : Rs. 150/-

ISBN No. : 978-93-82287-02-5

(نیو ایج پرنٹنگ پریس، ممبئی میں طبع ہوئی)

منٹو

کے

مدّاحین اور معترضین

کے نام

فہرست

اپنی بات

ہندستانی پرچار سبھا کو ایک مختصری خاموشی کے بعد ایک بار پھر اُردو کے مایہ ناز افسانہ نگار، منٹو پر ''سعادت حسن منٹو، عصرِ حاضر کے آئینے میں'' کتاب شائع کر کے اپنے اشاعتی سلسلے کو استوار کرنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔

ہندستانی پرچار سبھا وقفے وقفے سے مختلف موضوعات پر اُردو اور ہندی میں کارآمد کتابیں شائع کرتی رہی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اُردو کے قلم کاروں نے ہماری آواز پر لبیک کہا اور اپنی نگارشات سے نوازا۔ اس کتاب میں شامل مضامین منٹو کے قلم کی جولانیت کا مختلف پہلوؤں سے احاطہ کرتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ اشاعت منٹو کو ازسرِ نو سمجھنے اور پرکھنے میں مددگار ثابت ہوگی۔

فیروز این پیچ
(اعزازی سکریٹری)
ہندستانی پرچار سبھا

ممبئی
یکم جنوری 2013ء

عرضِ مُرتّب

دنیائے ادب میں منٹو صدی منائی جارہی ہے اور بڑی دھوم سے منائی جارہی ہے۔ دنیائے ادب کے معدودے چند اہل قلم ہیں جن کی تخلیقات کو قارئین نے صدیوں سراہا اور اُن کے ادب کو پشت در پشت پڑھ کر اُس پر اپنے اظہار رائے سے اُس کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا۔ یہ سعادت، سعادت حسن منٹو کو بھی نصیب ہوئی جو آج ملکوں اور زبانوں کی حد بندی سے کافی آگے نکل گیا ہے اور اس کی صدی کی تقریبات جاری ہیں۔

منٹو نے اپنی تخلیقات میں انسانی زندگی کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا۔ جو بھی دیکھا، جہاں بھی دیکھا بڑی بے باکی سے سپردِ قرطاس و قلم کیا۔ ایسا کرنے میں اُسے کافی دشواریوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ وہ دشواریوں سے گزرتا رہا اور اپنی روز مرّہ کی ضروریات پوری کرتا رہا۔ دو وقت کی روٹی اور شراب کے دو گھونٹ شاید یہی اُس کے لیے سب کچھ تھا اس مناسبت سے دیکھیں تو حقیقی معنوں میں وہ قلم کا مزدور تھا۔ کہانیاں لکھتا اور ایڈیٹر حضرات تک پہنچا کر پسینہ سوکھنے سے پہلے اپنی مزدوری حاصل کرتا۔ اُس کی چند تخلیقات پر فحاشی اور عریانیت کا لیبل بھی لگا لیکن اُس نے اُس کی ذرا بھی پروا نہیں کی، اس لیے کہ یہ اُس کی زندگی کا حصہ بن گیا تھا۔ اُسے ہر حال میں جینا تھا اور اپنی تخلیقات میں اُن کرداروں کو زندہ جاوید کرنا تھا جو حالات سے نبرد آزما ہے۔ اُنہیں کرداروں نے آج قاری کو سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ آج کا قاری بیدار قاری ہے لہٰذا وہ اُن تحریروں میں پوشیدہ فلاحی اصلاح کا پہلو تلاش کر رہا ہے تاکہ بنی نوع انسان کی زندگی کو نئی سمت ملے۔ روشنی کے نئے مینار نظر آئیں اور اپنی زندگی کو عزت و آبرو اور انسانی اقدار کے سانچے میں ڈھال کر پُرمُسرّت لمحات میں گزار سکے۔ پروفیسر صادق نے 'ابھی نو اِمروز' کے اکتوبر، نومبر، دسمبر ۲۰۱۲ء کے منٹو نمبر میں اپنی بات چیت میں رسالے کے چیف ایڈیٹر سے بڑی دلچسپ بات کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں 'سعادت حسن منٹو (ﷺ) کے آباؤ اجداد سارَسوَت برہمن تھے اور اُن کی' آل منٹو' تھی جیسے دوسرے کشمیری برہمنوں کی آل نہرو، کچلو، کاٹجو، متو، گنجو اور سپرو ہے۔ یہاں آکر واضح ہو جاتا ہے کہ سعادت حسن نہ تو مُنٹو ہے اور نہ ہی مِنٹو بلکہ مَنٹو ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اِس نام کے زبان زدِ عام ہونے تک عرصہ بیت جائے گا۔

اُن کے اِبتدائی افسانوں میں طوالت ہوتی تھی ۱۹۵۰ء میں 'خالی بوتلیں خالی ڈبے' کی اشاعت (مکتبہ جدید لاہور) کے ساتھ وہ ختم ہوئی۔ اُنہوں نے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے"اس مجموعے کا ہر افسانہ

ایک ہی نشست میں لکھا گیا ہے۔ یہ افسانے میرے پہلے افسانوں سے کسی قدر مختلف ہوں گے۔ان میں الفاظ بقدر کفایت استعمال کئے گئے ہیں۔فروعی تفصیلات سے پرہیز کیا گیا ہے۔ یہ امر ملحوظ خاطر رہا ہے کہ کم سے کم الفاظ میں حرف مدعا بیان ہو جائے۔'' اسی پیش لفظ میں وہ اپنے دوسرے مجموعے 'ٹھنڈا گوشت' کے بارے میں لکھتے ہیں کہ'' ایسے ہی افسانوں کا دوسرا مجموعہ 'ٹھنڈا گوشت' کے عنوان سے پیش کر رہا ہوں۔ جو غالباً 'خالی بوتلیں خالی ڈبے' کے ساتھ ہی مارکٹ میں آ جائے گا۔ یہ مجموعہ بھی مکتبہ جدید ہی شائع کر رہا ہے۔ 'ٹھنڈا گوشت' وہ افسانہ ہے جس کو فاضلِ عدالت ماتحت نے فحش قرار دے کر مجھے تین سو روپے جرمانہ اور تین مہینے قید بامشقت کی سزا دی تھی لیکن اپیل کرنے پر سیشن کورٹ نے مجھے بَری کر دیا۔''

'ٹھنڈا گوشت، کالی شلوار، بؤ چاہے کوئی افسانہ ہو نئے زمانے، نئے رجحانات نے ان سے فحاشی کا لیبل نکال دیا ہے۔اب انہیں اُن کے پس منظر کو حالاتِ حاضرہ کے ساتھ تقابلی انداز سے پرکھا جا رہا ہے اور محسوس کیا جا رہا ہے کہ اُن کہانیوں کا خالق اپنے دور میں قدر کی نگاہ سے بھلے نہ دیکھا جاتا ہو آج کا قاری اُسے انسانی اقدار پر پرکھ رہا ہے۔ اُسے اس کی تحریر میں مضمر وہ انسانی جذبات، مجبوریاں اور ضرورتیں ملتی ہیں جو اگلے وقتوں کے لوگ نہ دیکھ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر شعرا اور ادبا اپنے دور میں بدنام و ناکام رہے لیکن وقت کی کروٹ نے اُن کی تحریر میں پوشیدہ سچائی کو محسوس کیا اور اُسے اپنی صدی کا مقبول شاعر و ادیب بنا دیا۔ آج بھی بے شمار قلم کار ہیں جنھیں گالیوں اور جوتوں کا سامنا کرنا پڑا مگر قلیل مدّت میں اُنہیں انعام و اعزاز کا حقدار قرار دیا گیا۔

سعادت حسن منٹو کی صدی کے موقع پر ہندستانی پرچار سبھا کی جانب سے کتابی شکل میں بعنوان ''سعادت حسن منٹو، عصرِ حاضر کے آئینے میں'' خراج عقیدت پیش کیا جا رہا ہے۔ میں اس کتاب میں شامل مضامین کے لیے تمام قلم کاروں کا تہہ دل سے مشکور و ممنون ہوں۔ ہندستانی پرچار سبھا کی انتظامیہ کمیٹی اور بالخصوص اعزازی سکریٹری جناب فیروز این ہیچ صاحب کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اس کتاب کی اشاعت کے لیے بخوشی اجازت دے دی۔ جناب اطہر عزیز صاحب کا بے حد مشکور ہوں کہ اُنہوں نے اس کتاب کی اشاعت میں مفید مشوروں سے نوازا اور اپنے بھرپور تعاون سے رفاقت و ادب کے رشتے کو مستحکم کیا۔ میں اپنے ساتھی جناب علی عباس رضوی کا بھی شکر گزار ہوں جن کے تعاون کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔

(محمد حُسین پرکار)

کے کے کھلر

منٹو، اُردو ادب کا سیاہ حاشیہ

منٹو کی زندگی ایک رنگین فلم کی طرح تھی ۔ وہ ایک ایسی ڈاکیومنٹری تھی جس کے فلم ساز نے اس کے ہر سین میں جان ڈال دی ہو۔ فلمیں دیکھنے کا شوق منٹو کو بچپن سے تھا۔ امرتسر میں اس کا وہ گھر جو کوچہ وکیلاں میں تھا، فلمی رسائل اور فلمی ایکٹر، ایکٹریسوں کے فوٹوؤں سے بھرا پڑا رہتا تھا۔ سعادت حسن جب منٹو کے نام سے مشہور ہوا تو بھی اسے ادبی دُنیا کا چارلی چیپلن کہا جاتا تھا۔ اس کی ہر بات کا رنگ نرالا تھا۔ اس کی ہر ادا انوکھی تھی وہ ایسے راستے کا مُسافر تھا جو سفر کو اپنی منزل اور منزل کو سفر سمجھتا تھا۔

منٹو اگر آج زندہ ہوتا تو پورے برِصغیر میں اس کی 100 ویں سالگرہ منائی جاتی ۔ بیشک وہ ۱۹۵۵ء کے بعد کوئی اور افسانہ نہ لکھتا۔ اُردو افسانہ کے صحرا میں وہی ایک نخلستان نظر آتا ہے کہ کچھ ادیبوں نے سر اُٹھائے ہیں لیکن یا تو وہ انگریزی افسانوں کے پھس پھسے چربے ہیں یا وہ نقل کے عمل میں بے جان کر دیئے گئے ہیں ۔ منٹو اُردو ادب کا ایک ایسا 'گنجا فرشتہ' تھا جس نے بڑے سے بڑے فرشتے کو بے نقاب کیا۔ نقاد کو ننگا کیا اور ایک نئی حقیقت نگاری کی بُنیاد ڈالی ۔

مرنے سے تین سال پہلے' گنجے فرشتے' کے عنوان سے منٹو نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا:

''دنیا کے ہر مہذب ملک اور ہر مہذب سماج میں یہ اُصول مروّج ہے کہ مرنے کے بعد خواہ دشمن ہی کیوں نہ ہو اُسے اچھے الفاظ کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے صرف محاسن بیان کئے جاتے ہیں ۔ اور عیوب پر پردہ ڈالا جاتا ہے۔ میں ایسی دنیا پر، ایسے مہذب ملک پر، ایسے مہذب سماج پر ہزار لعنت بھیجتا ہوں جہاں یہ اصول مروّج ہو کہ مرنے کے بعد ہر شخص کا کردار اور تشخص لانڈری میں بھیج دیا جائے ۔ جہاں سے وہ دُھل دھلا کر آئے اور رحمت اللہ علیہ کی کھونٹی پر لٹکا دیا جائے ۔ میرے اصلاح خانہ میں کوئی شانہ نہیں کوئی شیمپو نہیں ۔ کوئی گھونگھر پیدا

کرنے والی مشین نہیں۔ میں بناؤ سنگھار کرنا نہیں جانتا۔ آغا حشر کی بھینگی آنکھ مجھ سے سیدھی نہ ہو سکی۔ اس کے منہ سے گالیوں کے بجائے میں پھول نہیں جھڑا سکا۔ میرا جی کی غلاظت پر مجھ سے استری نہیں ہو سکی۔ اور نہ میں اپنے دوست شیام کو مجبور کر سکا کہ وہ برخود غلط عورتوں کو سالیاں نہ کہے۔ اس کتاب میں جو بھی فرشتہ آیا ہے اسکا مونڈن ہوا ہے اور یہ رسم میں نے بڑے سلیقے سے ادا کی ہے۔''

یہ تھا منٹو..... افسانوں کی جھوٹی دنیا کا سچا آدمی، نقاد کے منہ پر طمانچہ..... جس نے عورتوں اور طوائفوں پر بے تحاشہ لکھا لیکن آج کل کے افسانہ نویسوں کی طرح اس کے اعصاب پر عورت سوار نہیں تھی۔ منٹو کے قلم میں وہ پیبا کی تھی جس سے اردو ادب کے بڑے بڑے اولیا کانپتے تھے۔ منٹو تانگے والے اور غریب مزدوروں کا ادیب تھا جسے نہ سیڑھیوں اور نہ سہاروں کی ضرورت تھی۔ اس کی بے وقت موت نے نہ جانے ہم سے کتنے منگو کوچوان اور کتنی سوگندھیاں چھین لیں۔ زندگی نے منٹو کے ساتھ انصاف نہیں کیا لیکن تاریخ ضرور انصاف کرے گی۔

۵۷ رسال بعد آج بھی دنیا منٹو کو یاد کرتی ہے۔ درزی، دلال، تانگے والا، پان والا، منٹو کے افسانوں میں تانگے والے گھوڑے ہانکتے ہیں، رئیسی نہیں فرماتے۔ شاعر شاعری کرتے ہیں، عنوان بدل کر نظمیں نہیں چھپواتے، ان کی اشاعت کے لیے اخباروں کے نمائندوں کے جوتے نہیں چاٹتے۔ ایڈیٹروں کو دعوتیں نہیں دیتے۔ منٹو کا کوئی کردار کسی کے جعلی ایڈیشن نہیں بیچتا۔۔۔ آج منٹو کا نام لینے والے اس کے جعلی ایڈیشن چھاپ کر لاکھوں کما رہے ہیں۔ منٹو کے کرداروں سے اور ان کی بات چیت سے گھٹیا بیڑوں اور ادھ جلی ماچسوں، موم بتیوں اور پسینے کی بُو آتی ہے لیکن اس کے باوجود اس کے بھی صنم خانے ہوتے ہیں۔ وہ شعر پڑھ کر چابک لگاتے ہیں۔ آج کل کے شاعر شعر پڑھ کر چابک کھاتے ہیں۔ منٹو کے کردار لینن اور کارل مارکس کے شکار نہیں ہیں۔ منگو کوچوان، ڈھونڈو، شنکر، خوشیا عام انسان ہیں۔ جو آج کے اُردو افسانہ نویسوں کے افسانوں میں نہیں پائے جاتے۔ آج کل کا افسانہ نویس قبریں کھودتا ہے، لیکن اسے کچھ نہیں ملتا۔ روس اور پاکستان کے دورے پر جاتا ہے۔ امریکہ اور انگلستان میں

مُشاعرہ کرواتا ہے لیکن پھر بھی وہ صفر کے ذرا اُوپر ہے۔ وہ خود فریبی کا شکار ہے۔ منٹو کے کردار اپنے خالق کی طرح بے باک ہیں۔ خود فریبی کا شکار نہیں ہیں۔ خوشیا ایک دلال ہے جو کہ محلے کی تمام چھوکریوں کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔ کون کہاں رہتی ہے، کس کا کس بینک میں کتنا پیسہ ہے، کس کے پاس کتنی ساڑیاں ہیں کتنے پیٹی کوٹ، لیکن کانتا جب اس کے سامنے ننگی نمودار ہوتی ہے تو وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ ... یہاں سے منٹو کہانی کا سلسلہ شروع کرتا ہے۔ اور خوشیا کی اصلی شخصیت اور اس کا پورا کردار مکمل طور پر ایسے نمایاں ہوتا ہے، جیسے شیشے میں عکس۔ عابد علی صاحب کا منٹو پر تجزیہ اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ منٹو کا اپنا عمل۔ منٹو عوام کا ادیب تھا اور اس کے قلم کا نکھار خدا کی دین تھا۔ آج اردو کے افسانہ نویس کی حالت اس کھوئے ہوئے ٹکٹ کی طرح ہے جو پلیٹ فارم پر کسی مسافر کو یکلخت مل جائے۔ اردو میں اچھی اور بیباک کہانی چراغ لے کر ڈھونڈھے سے نہیں ملتی۔ منٹو نے ایک بار لکھا تھا:

''اگر میری موت کے بعد میری تحریروں پر ریڈیو، لائبریریوں کے دروازے کھول دیئے جائیں اور میرے افسانوں کو وہی رُتبہ دیا گیا جو اقبال مرحوم کے شعروں کو دیا جا رہا ہے تو میری روح سخت بے چین ہوگی۔ اور میں اس بے چینی کے پیش نظر اس سلوک سے بے حد مطمئن ہوں جو مجھ سے روا رکھا گیا ہے، خدا مجھے اس دیمک سے محفوظ رکھے، جو قبر میں میری سُوکھی ہڈیاں چاٹے گی۔ یونیورسٹی کے پروفیسر نما نیم نقاد اور اردو کے ریسرچ اسکالر انگشت بدنداں ہیں کہ وہ شخص جو دسویں جماعت کے اردو کے پرچے میں فیل تھا ایسے خوبصورت افسانے ایسے خوبصورت انداز میں کیسے لکھ گیا۔ منوں مٹی کے اندر دبا ہوا منٹو ان لوگوں سے پوچھ رہا تھا، کتنے بنائے میرے کفن سے کتنے بدلے میرے مجموعوں کے، اور شومئی قسمت یہ وہی لوگ ہیں، جنہوں نے منٹو کی حیات میں اس کی زبردست مخالفت کی تھی۔ محمد عسکری نے ایک جگہ لکھا ہے، منٹو کو پانی پینے کے لیے اپنے آپ کنواں کھودنا پڑا۔ یہ علاحدہ بات ہے کہ جو کنواں کھودا تھا وہ ٹیڑھا، یا بھینگا تھا، یا اس کا پانی کھارا تھا، یا گدلا تھا۔

سوال یہ ہے کہ منٹو نے کنواں کھودا اور اس سے پانی نکلا۔ آج منٹو کے انتقال کے

۷۵رسال ہو گئے ہیں۔ کتنے اردو کے افسانہ نویس ہیں جن کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے کنواں کھودا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جو منٹو نے کنواں تھا اس میں بھی ان ادیبوں نے مٹی اور گارا بھر دیا ہے اور آج عالم یہ ہے کہ کنواں سُوکھ گیا ہے۔ آج اردو کا افسانہ نگار احساس سے ڈرتا ہے اور جذبے سے خوف زدہ ہے۔ وہ محض ایک مداری ہے جو کبھی کسی سیمینار میں نظر آتا ہے، یا کسی نشست میں۔ سیمیناروں سے اسے فرصت نہیں ملتی ہے۔ دلّی کے ایک افسانہ نگار ہیں، وہ دلی میں صرف اس وقت پائے جاتے ہیں جب وہ بیمار ہوں۔ سارا سال مصروفیت کا عالم ہے، ملنا مشکل ہے۔ منٹو سیمیناروں میں نہیں جاتا تھا، وہ لکھتا تھا اور عوام میں گھومتا تھا۔ آج کا افسانہ نگار کس کو چونکائے گا وہ تو خود ننگا ہے، نہائے گا کیا اور نچوڑے گا کیا۔ اس میں اور نقاد میں کوئی فرق نہیں رہا۔ اگر ایک اخبار یا رسالے میں وہ افسانہ نویس ہے تو دوسرے رسالے میں وہ نقاد کا رول ادا کر رہا ہے۔ فرصت میں وہ شعر بھی کر لیتا ہے۔ مزید فرصت میں وہ بچوں کو پڑھانے کا کام بھی کر لیتا ہے۔

پچھلے ۷۵رسالوں میں نہ تو کوئی ہتک لکھی گئی اور نہ ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ سیاہ حاشیوں کے لیے کافی مواد تھا، لیکن لکھے نہیں گئے۔ مضمون نگاری تو خوب ہوئی۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اردو کے ادیبوں نے کافی مذاکرات کیے۔ لیکن افسانے نہیں لکھے۔ میرے ایک جگری دوست ہیں جو افسانہ نویس بھی ہیں، جب میں ان سے کہتا ہوں کہ منٹو کے بعد اردو افسانہ اپنے مسیحا کا انتظار کر رہا ہے۔ تو وہ کہتے ہیں کہ تم میرے ساتھ ناانصافی کر رہے ہو۔ آج کل انہوں نے میرا جگر مجھے واپس دے دیا ہے۔ اور اب صرف دوست ہی رہ گئے ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے کون منکر ہوگا کہ آج تک اردو کے کسی ادیب کا اتنا ماتم نہیں ہوا جتنا منٹو کا۔ اگر منٹو ۲۶رسال پہلے کچھ نہیں تھا تو ۲۶رسال بعد بھی حالت وہی ناگفتہ بہ ہے، وہی عالم، وہی بے بسی، وہی 'خالی بوتلیں خالی ڈبے' ہیں آج جہاں منٹو جیسے بانکے اور بیباک افسانہ نویس اور صاف گو کی اشد ضرورت ہے۔ وہاں اردو ادب اور افسانے کو جعلی اور فقرہ باز نقادوں سے رہائی کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے۔

اپنی چھوٹی سی کہانی 'بیگو' میں منٹو ہم سے کچھ اس طرح رخصت لیتا ہے:

جب اس کو غسل دینے لگے تو اسپتال کے ایک نوکر نے مجھے بلایا اور کہا "ڈاکٹر صاحب اس کی مٹھی میں کچھ ہے۔ میں نے اس کی بند مٹھی کھول کر دیکھا تو لوہے کے دو کلپ تھے اس کی بیگو کی یادگار۔

"ان کو نکالنا نہیں، یہ ان کے ساتھ ہی دفن ہوں گے" میں نے غسل دینے والوں سے کہا اور دل میں غم کی ایک عجیب وغریب کیفیت لیے دفتر چلا گیا۔

منٹو کے افسانے 'بیگو' کے کلپ تھے۔ اردو کے نقادوں نے انہیں منٹو کے ساتھ دفنا دیا۔ سعادت حسن کو صرف منٹو ہی سمجھتا تھا۔ اور منٹو کو سعادت حسن۔ دونوں ایک دوسرے کے کردار کی نمائندگی کرتے تھے۔ وارث علوی اپنی کتاب "تیسرے درجے کا مسافر" میں لکھتے ہیں "اگر اسلوب شخصیت کا اظہار ہے تو شخصیت جتنی زیادہ رچی ہوئی ہوگی اتنا ہی اسلوب میں رچاؤ ہوگا۔ منٹو کا اسلوب ایک بے درد اور سفاک حقیقت نگار کا اسلوب ہے۔ لیکن اس اسلوب کے پیچھے جو شخصیت ہے، اسلوب میں سفا کی اسی وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ منٹو نے دردمند آدمی کی شخصیت کو پس پردہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ منٹو فن کے جس پُلِ صراط سے گزر رہا تھا اس میں ذرا بھی توازن گنوانے کا مطلب تھا یا تو وہ ترحم کا شکار ہو جاتا یا طنز نگاری کا، یا تو وہ رنڈیوں پر رحم کھانا شروع کر دیتا، یا سماج پر طنز کرتا۔ رحم یا طنز کی صورت میں اس کی ذات کی نمائش اور انا کی تسکین تو ہو جاتی ہے لیکن اس کے افسانے اس کیفیت سے محروم رہ جاتے جو زندگی کے زہر کو اپنی روح میں جذب کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ فن کے پل صراط سے گزرنا اور چیز ہے اور مہالکشمی کے پل کو پار کرنا دوسری چیز ہے۔"

وارث علوی کو شاید یہ معلوم نہیں ہے کہ دہلی میں ایک اور پل ہے جس کا نام 'کوڑیا پل' ہے جو دہلی ریلوے اسٹیشن کے بالکل ساتھ ہے۔ کشمیری گیٹ جانے کے لیے یہ شارٹ کٹ ہے جہاں اس پل کو پار کرنے کے لیے ہر مرد و زن کو ایک کوڑی دینی پڑتی تھی۔ منٹو اس پُل کو روز پار کرتا تھا، دیوداسیوں تک پہنچنے کے لیے زندگی کی پراسراریت تک پہنچنے کے لیے۔ اس کی

المنا کیوں کے لیے۔تہذیب کو تاریخی پس منظر میں دیکھنے کے لیے۔منٹو کشمیری گیٹ کا حامی تھا۔شاید اس لیے کہ وہ اسے اپنے کشمیری ہونے کی یاد دلایا تھا۔منٹو کے آباواجداد کشمیر سے آ کر امرتسر میں بس گئے تھے۔منٹو کا آبائی مکان بھی کشمیری محلّہ کوچہ وکیلاں میں تھا۔اس کے والد غلام حسن منٹو کی تصویری تفصیل بھی ان کے کشمیری ہونے کا اعلان دور سے کرتی ہے' بند کالر کا کوٹ ، سر پر کشمیری وضع کی پگڑی خشخشی داڑھی ، بڑی بڑی خشخشی نگاہیں''۔منٹو بچپن میں ہمیشہ کشمیری ٹوپی پہنتا تھا۔کشمیر جانے کی تمنا اس کی زندگی بھر پوری نہ ہوئی۔ایک دفعہ تہیہ کرنے کے باوجود بانہال سے آ گیا تھا۔جب بٹوت کے پڑاؤ میں بس رُکی تو وہیں لاری سے اپنا اسباب اُتروالیا۔یہاں اسے ایک چرواہن ملی تھی۔جس کی کو ہنی وہ ساری عمر نہیں بھول سکا۔ ''بابو گوپی ناتھ''میں جو زینب ہے اسے''کشمیری کبوتری'' کہتا ہے۔

وہ نواب کشمیری کے فن کا بھی قائل تھا۔اس فلم ایکٹر نے اپنی پہلی بیوی کی حیات میں دوسری شادی کر لی تھی اور پہلی بیوی کو خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔پھر بھی وہ اپنے دس ہزار کی رقم جو اس نے بیمہ کرائی تھی ،نواب کے نام کر گئی تھی۔نواب کا ذکر کرتے ہوئے منٹو لکھتا ہے کہ:

آپ کشمیری ہیں اور میں بھی ، آپ نہرو ہیں اور میں منٹو۔کشمیری ہونے کا دوسرا مطلب خوبصورت ہے۔اور خوبصورتی کا مطلب جو میں نے ابھی تک نہیں دیکھا۔مدت سے میری تمنا تھی کہ آپ سے ملوں (شاید بشرط زندگی میں ملاقات ہو بھی جائے) میرے بزرگ تو آپ کے بزرگوں سے اکثر ملتے جلتے رہتے ہیں لیکن یہاں کوئی ایسی صورت نہ نکلی کہ آپ سے ملاقات ہو سکے۔یہ کتنی بڑی ٹریجڈی ہے کہ میں نے آپ کو دیکھا تک نہیں ،آواز ریڈیو پر البتہ ضرور سُنی ہے،وہ بھی ایک دفعہ۔جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں مُدّت سے میری تمنا تھی کہ آپ سے ملوں ،اس لیے کہ آپ سے میرا کشمیر کا رشتہ ہے۔لیکن اب سوچتا ہوں اس کی ضرورت ہی کیا ہے،کشمیری کسی نہ کسی راستے سے کسی نہ کسی چوراہے پر دوسرے کشمیری سے مل جاتا ہے۔آپ کسی نہر کے قریب آباد ہوئے اور نہرو ہو گئے اور میں ابھی تک سوچتا ہوں کہ منٹو کیسے ہو گیا۔ آپ نے تو خیر لاکھوں مرتبہ کشمیر دیکھا ہوگا،مگر مجھے صرف بانہال تک جانا نصیب ہوا ہے۔

میرے کشمیری دوست جو کشمیری زبان جانتے ہیں مجھے بتاتے ہیں کہ منٹو کا مطلب 'منٹ' ہے یعنی ڈیڑھ سیر کا بٹہ ۔ آپ یقیناً کشمیری زبان جانتے ہوں گے۔ اس خط کا جواب لکھنے کی اگر آپ زحمت فرمائیں تو مجھے ضرور لکھئے کہ ''منٹو'' کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ اگر میں صرف ڈیڑھ سیر ہوں تو میرا، آپ کا مقابلہ نہیں۔ آپ پوری نہر میں اور میں صرف ڈیڑھ سیر۔ آپ سے میں کیا ٹکر لے سکتا ہوں؟ لیکن ہم دونوں ایسی بندوقیں ہیں جو کشمیریوں سے متعلق مشہور کہاوت کے مطابق ''دھوپ میں لبلس کرتی ہیں۔''

معاف کیجئے گا، آپ اس کا بُرا نہ مانئے گا۔ میں نے بھی یہ فرضی کہاوت سنی تو، کشمیری ہونے کی وجہ سے میرا تن بدن جل گیا۔ چونکہ یہ دلچسپ ہے اس لیے میں نے اس کا ذکر تفریحی کر دیا۔ حالانکہ میں اور آپ دونوں اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم کشمیری کسی میدان میں آج تک نہیں ہارے۔ سیاست میں آپ کا نام میں بڑے فخر سے لے سکتا ہوں کیونکہ آپ بات کی فوراً تردید کرنا خوب جانتے ہیں۔ پہلوانی میں ہم کشمیریوں کو کس نے ہرایا ہے۔ شاعری میں ہم سے کون بازی لے سکا ہے۔ لیکن مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی ہے کہ آپ ہمارا دریا بند کر رہے ہیں، لیکن پنڈت جی آپ تو صرف نہرو ہیں۔ افسوس کہ میں ڈیڑھ سیر کا بٹہ ہوں۔ اگر میں تیس چالیس ہزار من کا پتھر ہوتا تو خود کو اس دریا میں لڑھکا دیتا کہ آپ کچھ دیر کے لیے اس کو نکالنے کے لیے اپنے انجینئروں سے مشورہ کرتے رہتے۔

''کشمیری میں بھی ہوں لیکن اتنا ظالم نہیں جتنا وہ تھا۔ اس نے صرف اولاد کی خاطر اپنی پہلی بیوی کو خودکشی پر مجبور کر دیا۔ میں اپنے اُن کشمیریوں سے سخت نفرت کرتا ہوں جو اپنی بیوی کے ساتھ برا سلوک کریں۔'' منٹو کی بیوی بھی کشمیری تھی لیکن صفیہ کے ساتھ اس کا سلوک مثالی تھا۔ بیوی نے منٹو کا پورا ساتھ دیا۔ منٹو جس کو باپ کی محبت نصیب نہ ہوئی، بھائیوں کا پیار نصیب نہ ہوا، عزیزوں اور رشتے داروں نے اسے آوارہ کا لقب دیا۔ وہ پہلے امرتسر اور پھر ممبئی سے ''شہر بدر'' ہوا۔ فحاشی کے الزام میں پانچ مرتبہ کچہریوں کی خاک چھانی۔ سینکڑوں افسانے لکھنے کے باوجود مالی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ پھر اس نے پینا شروع کر دیا۔

زندگی کے آخری تین سال وہ سسرال کے سہارے پڑا رہا۔ آخری ایام میں اسے پورا احساس تھا کہ وہ ایک ذلت بھری زندگی بسر کر رہا ہے۔ لوگوں کے رویّوں نے اسے ذہنی اور جسمانی اپاہج بنا دیا تھا۔ اب وہ پاگل خانے بھی ہو آیا تھا۔ اور آخرکار ایک دن شام ۱۷ر جنوری ۱۹۵۵ء کو اسے خون کی قے آئی۔ صفیہ ڈاکٹر اور ایمبولینس لانے کے لیے دوڑی، تو منٹو نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''مت جاؤ صفیہ، مت جاؤ، میرے پاس بیٹھو، مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ اب قصہ تمام ہو چکا، مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ ڈاکٹر کچھ نہیں کر سکتا۔ کچھ نہیں کر سکے گا۔ اب یہ ذلت ختم ہونی چاہئے''۔ لیکن صفیہ ایمبولینس لینے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد وہ بار بار یہی الفاظ دہراتا رہا ''اب ذلت ختم ہونی چاہئے۔ اب یہ ذلت ختم ہو جائے گی۔

بہت کم لوگوں کو پتہ ہے کہ منٹو نے ایک چٹھی پنڈت جواہر لال نہرو کو لکھی تھی۔ اس چٹھی کی تاریخ ۲۷ر اگست ۱۹۵۷ء ہے۔

'' پنڈت جی السلام علیکم۔

یہ میرا پہلا خط ہے جو میں آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ آپ ماشاء اللہ امریکنوں میں بڑے حسین متصور کئے جاتے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میرے خدوخال کچھ ایسے بُرے نہیں ہیں۔ اگر میں امریکہ جاؤں تو شاید مجھے بھی حسن کا رتبہ عطا ہو جائے۔ لیکن آپ ہندوستان کے وزیر اعظم ہیں اور میں پاکستان کا عظیم افسانہ نگار۔ ان میں بہت بڑا تفاوت ہے۔ بہرحال ہم دونوں میں ایک چیز مشترک ہے، پنڈت جی، اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ بہت بڑے آدمی ہیں۔ آپ ہندوستان کے وزیر اعظم ہیں، اس ملک پر جس سے ہمارا بھی تعلق رہا ہے، آپ کی حکمرانی ہے، آپ سب کچھ ہیں، لیکن گستاخی معاف کہ آپ نے اس خاکسار (جو کشمیری ہے) کی کسی بات کی پرواہ نہیں کی۔ دیکھئے، میں آپ سے ایک دلچسپ بات کا ذکر کرتا ہوں۔ میرے والد صاحب (مرحوم) جو ظاہر ہے کشمیری تھے، جب کسی ''ہاتو'' کو دیکھتے تو اسے گھر لے آتے، ڈیوڑھی میں بٹھا کر اسے نمکین چائے پلاتے ساتھ قلچہ بھی ہوتا۔ اس کے بعد وہ بڑے فخر سے اس ''ہاتو'' سے کہتے ''میں بھی کاشر ہوں'' پنڈت جی آپ کاشر

ہیں۔ خدا کی قسم اگر آپ میری جان لینا چاہیں تو ہر وقت حاضر ہے۔ میں جانتا ہوں بلکہ سمجھتا ہوں کہ آپ صرف اس لیے کشمیر کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں کہ آپ کو کشمیر سے کشمیری ہونے کے باعث بڑی مقناطیسی قسم کی محبت ہے۔ یہ ہر کشمیری کو خواہ اس نے کبھی کشمیر دیکھا بھی نہ ہو، ہونا چاہئے۔ جیسا کہ میں اس خط میں پہلے لکھ چکا ہوں، میں صرف بانہال تک گیا ہوں۔ کد، بٹوت، کشتواڑ، یہ سب علاقے میں نے دیکھے ہیں، لیکن حسن کے ساتھ میں نے افلاس چپکا دیکھا۔ اگر آپ نے اس افلاس کو دور نہیں کر دیا ہے تو آپ کشمیر اپنے پاس رکھئے مگر مجھے یقین ہے کہ آپ کشمیری ہونے کے باوجود اسے دور نہیں کر سکتے، اس لیے کہ آپ کو اتنی فرصت ہی نہیں۔ آپ ایسا کیوں نہیں کرتے۔ میں آپ کا پنڈت بھائی ہوں۔ مجھے بلا لیجئے، میں پہلے آپ کے گھر شلجم کی شب دیگ کھاؤں گا، اس کے بعد کشمیر کا سارا کام سنبھال لوں گا۔ یہ بخشی وغیرہ اب بخش دینے کے قابل ہیں، اول درجے کے چار سو بیس ہیں انہیں آپ نے خواہ مخواہ اپنی ضروریات کے مطابق اعلیٰ رتبہ بخش دیا ہے۔ آخر کیوں؟ میں سمجھتا ہوں کہ آپ سیاست داں ہیں، جو کہ میں نہیں ہوں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں کوئی بات سمجھ نہ سکوں۔ بٹوارہ ہوا۔ ریڈکلف نے جو جھک مارنا تھا مارا۔ آپ نے جونا گڑھ پر ناجائز طور پر قبضہ کر لیا۔ جو کوئی کشمیری، کسی مرہٹے کے زیر اثر ہی کر سکتا ہے۔ میرا مطلب پٹیل سے ہے (خدا اسے مغفرت کرے)۔ حیدرآباد پر بھی آپ نے جارحانہ حملہ کیا۔ وہاں ہزاروں مسلمانوں کا خون بہایا اور آخر میں اس پر قبضہ جما لیا۔ کیا یہ سراسر زیادتی نہیں آپ کی؟ آپ انگریزی زبان کے ادیب ہیں۔ میں اردو میں افسانہ نگاری کرتا ہوں۔ اس زبان میں جس کو آپ کے ہندوستان میں مٹانے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ پنڈت جی میں آپ کے بیانات پڑھتا رہتا ہوں۔ ان سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ آپ کو اردو عزیز ہے، لیکن میں نے آپ کی ایک تقریر ریڈیو پر جب ہندوستان کے دو ٹکڑے ہوئے تھے، سُنی۔ آپ کی انگریزی کے تو سب قائل ہیں، لیکن جب آپ نے نام نہاد اردو میں بولنا شروع کیا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ کی انگریزی تقریر کا ترجمہ کسی کٹر مہاسبھائی نے کیا ہے جسے پڑھتے وقت آپ کی زبان کا ذائقہ درست نہیں تھا۔ آپ ہر

فقرے پر ابکائیاں لے رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے ایسی تحریر پڑھنا قبول کیسے کی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ریڈکلف نے ہندوستان کی ڈبل روٹی کے دو توس بنا کر رکھ دیئے تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک وہ سینکے نہیں گئے۔ ادھر آپ سینک رہے ہیں اور ادھر ہم۔ لیکن آپ کی ہماری انگیٹھیوں میں آگ باہر سے آرہی ہے۔ پنڈت جی، آج کل بگوگوشوں کا موسم ہے۔ گوشے تو خیر میں نے بے شمار دیکھے ہیں لیکن بگوگوشے کھانے کو جی چاہتا ہے۔ یہ آپ نے کیا ظلم کیا کہ بخشی کو سارا حق بخش دیا ہے کہ وہ بخشش میں بھی تھوڑے سے بگوگوشے نہیں بھیجتا۔ بخشی جائے جہنم اور بگوگوشے بھی۔ نہیں وہ جہاں ہیں سلامت رہیں، مجھے آپ سے دراصل یہ کہنا تھا کہ آپ میری کتابیں کیوں نہیں پڑھتے۔ آپ نے اگر پڑھیں ہیں تو مجھے افسوس ہے کہ آپ نے داد نہیں دی۔ اگر نہیں پڑھیں تو اور بھی زیادہ افسوس کا مقام ہے، اس لیے کہ آپ ادیب ہیں۔ آپ سے مجھے ایک اور بھی گلہ ہے۔ آپ ہمارے دریاؤں کا پانی بند کر رہے ہیں۔ اور آپ کی دیکھا دیکھی آپ کی راجدھانی کے پبلشر میری اجازت کے بغیر میری کتابیں دھڑا دھڑ چھاپ رہے ہیں۔ یہ بھی کوئی شرافت ہے۔ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ آپ کی وزارت میں ایسی کوئی بیہودہ حرکت ہو ہی نہیں سکتی۔ مگر آپ کو فوراً معلوم ہو سکتا ہے کہ دلی، لکھنؤ اور جالندھر میں کتنے ناشروں نے میری کتابیں ناجائز طور پر چھاپی ہیں۔ فحش نگاری کے الزام میں مجھ پر کئی مقدمے چل چکے ہیں۔ مگر یہ کتنی بڑی زیادتی ہے کہ دلی میں، آپ کی ناک کے عین نیچے وہاں کا ایک پبلشر میرے افسانوں کا مجموعہ ''منٹو کے فحش افسانے'' کے نام سے شائع کرتا ہے۔

میں نے کتاب ''گنجے فرشتے'' لکھی۔ اس کو آپ کے بھارت کے ایک پبلشر نے ''پردے کے پیچھے'' کے عنوان سے شائع کر دیا۔ اب بتایئے میں کیا کروں؟ میں نے یہ نئی کتاب لکھی ہے، اس کا دیباچہ یہی خط ہے جو میں نے آپ کے نام لکھا ہے۔ اگر یہ کتاب بھی آپ کے یہاں ناجائز طور پر چھپ گئی تو خدا کی قسم میں کسی نہ کسی دن دلی پہنچ کر آپ کو گریبان سے پکڑ لوں گا، پھر چھوڑوں گا نہیں آپ کو۔ آپ کے ساتھ ایسا چمٹوں گا کہ آپ ساری عمر یاد

رکھیں گے، ہر روز صبح کو آپ سے کہوں گا کہ نمکین چائے پلائیں۔ ساتھ ایک تافتانہ بھی ہو۔ شلجموں کی شب دیگ تو خیر ہر ہفتے کے بعد ضرور ہوگی۔ یہ کتاب چھپ جائے تو میں ایک نسخہ آپ کو بھیجوں گا۔ امید ہے کہ آپ اس کی رسید سے مجھے ضرور مطلع کریں گے اور میری تحریر کے متعلق اپنی رائے سے بھی ضرور آگاہ کریں گے۔ آپ کو میرے اس خط سے جلے ہوئے گوشت کی بو آئے گی۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے وطن کشمیر میں ایک شاعر غنی رہتا تھا۔ جو غنی کشمیری کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے پاس ایران سے ایک شاعر آیا، اس کے گھر کے دروازے کھلے تھے، اس لیے کہ وہ گھر میں نہیں تھا۔ وہ لوگوں سے کہا کرتا تھا کہ میرے گھر میں ہے کیا جو میں دروازے بند رکھوں، البتہ جب میں گھر میں ہوتا ہوں تو دروازے بند کر دیتا ہوں، اس لیے کہ میں ہی تو اس کی واحد دولت ہوں۔ ایرانی شاعر اس کے ویران گھر میں اپنی بیاض چھوڑ گیا۔ اس میں ایک شعر نامکمل تھا۔ مصرعہ ثانی ہو گیا، مگر اولی اس شاعر سے نہیں کہا گیا تھا۔ مصرعہ ثانی یہ تھا:

کہ از لباس تو بوئے کباب می آید

جب وہ ایرانی شاعر کچھ دیر کے بعد واپس آیا تو اس نے اپنی بیاض دیکھی، مصرعہ اولی موجود تھا:

کدام سوختہ جاں دست زد بداماند

پنڈت جی، میں بھی ایک سوختہ جاں ہوں۔ میں نے آپ کے دامن پر اپنا ہاتھ دیا ہے، اس لیے کہ میں یہ کتاب آپ کے نام معنون کر رہا ہوں۔''

یہ خط منٹو نے پوسٹ نہیں کیا۔ یہ اس کی کتاب ''بغیر عنوان'' کا دیباچہ بنا۔ چار مہینے بائیس دن بعد منٹو اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ منٹو آج بھی منوں مٹی کے نیچے سویا ہوا یہ کہہ رہا ہے کہ میرے افسانے مت پڑھو۔ ان میں سے آپ کو جلے ہوئے گوشت کی بو آئے گی۔ منٹو نے اپنا مجموعہ ''ایک خالی بوتل'' سے منسوب کیا تھا۔ آج اس بوتل کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ اور اب وقت آ گیا ہے کہ وہ خموش شمع دوبارہ روشن کی جائے۔ تاریخ کا تقاضہ ہے کہ منٹو کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ اور نہایت افسوس کی بات ہے کہ پچھلے ۲۷ رسالوں میں منٹو پر ایک بھی کتاب نہیں لکھی گئی۔ منٹو اگر امریکہ اور روس میں پیدا ہوتا تو یقیناً آج اس کی تحریروں پر مشتمل

ایک علاحدہ اور مکمل لائبریری ہوتی۔ سوائے منٹو کے بقول ابوسعید قریشی، اردو کے کسی ادیب یا ادبی مورخ نے منٹو کی سوانح لکھنے کی بھی جرأت نہیں کی۔ منٹو نے فلموں کو کیا کچھ نہیں دیا تھا۔ لیکن فلمی دنیا بھی اسے بھول گئی۔ ابوسعید قریشی لکھتے ہیں:

''منٹو نیم کی طرح ایک ایسا پیڑ ہے، جس کے پتے کڑوے ہیں، پھل میٹھا۔ جو اس میں کڑواہٹ ہے وہ ہمارے خون کی مفسد مادوں کے لیے مفید ہے۔ عصمت باختہ رنڈی کے ہاں اسے باعصمت بیبیوں اور معصوم بچوں کے پَرتو نظر آتے ہیں۔ ان کے گناہ آلودہ پیرہن اس کے قلم کی روشنائی سے دُھل دھلا کر ہماری آپ کی بچیوں کی چُنریاں بن جاتی ہیں جن پر مائیں بڑے پیار سے گوٹا کناری لگاتی ہیں۔ رندوں کے پردے سے پرہیزگار نمودار ہوتے ہیں۔ اور قاتلوں کی بے رحم شکل وصورت کے پیچھے ممد بھائی جیسے رحم دل لوگ ملتے ہیں جو کسی کے سوئی بھی لگتے نہیں دیکھ سکے۔ وہ یہ کس طرح گوارہ کر سکتا ہے کہ ڈاکٹر سوئی بھی لگائے اور فیس بھی لے۔''

منٹو کو ممد بھائی کے ہاتھوں ومٹو بن جانا تو درکار تھا لیکن نقاد کے ہاتھوں وہ کچھ بھی بننے کو تیار نہیں تھا کیونکہ یہ نقاد ہی تو ہے جس نے آج کے ادیب کی بے اطمینانی کو جو اس کے اپنے گرد وپیش، اس کے اپنے معاشرے اور نظام کی پیداوار تھی، غلط تناظر میں پیش کر کے اور اس پر غلط لیبل چسپاں کر کے، اسے سراسر ''غلط'' ہی بنا دیا تھا۔ یہ نقاد وہی تو ہے جو منٹو کے افسانوں اور اس کے پڑھنے والوں کے درمیان کھڑا ہو کر رہنمائی کے نام پر بھٹکاؤ پیدا کر رہا تھا۔ یہ نقاد وہی تو ہے جس نے اردو کے اس عظیم افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کو کبھی ترقی پسند قرار دیا اور کبھی رجعت پسند۔ اس پر کبھی تو عریاں نگاری کا الزام لگایا اور کبھی اسے سنسنی خیز اور فحاشی کا مرتکب ٹھہرایا۔ اسے 'سرخا' کمیونسٹ اور دہشت پسند کے القاب سے یاد کیا گیا اور یہاں تک کہ سنکی اور پاگل تک قرار دیا گیا۔ ممد بھائی جب منٹو کو ومٹو کہہ کر مخاطب کرتا ہے تو منٹو اس پر ذرا بھی بُرا نہیں مانتا لیکن جب اس کا سوٹ سینے والا ٹیلر ماسٹر اس کی فلمی کہانی پر تنقید کرنے کے لیے منہ کھولنا چاہتا ہے تو منٹو اسے برداشت نہیں کر پاتا اور اس کا گریبان پکڑ لیتا ہے۔

منٹو سچائیوں کا متلاشی ایک بیباک فنکار تھا جس نے عمر بھر جھوٹ، فریب، دھوکا دہی اور گندگی کے جنگلوں میں سچائیوں کے پھول چننے کی کوشش کی ہے اور زندگی سے جو کچھ پایا ہے وہی اپنے افسانوں کی شکل میں اسے لوٹا دیا ہے۔ لیکن ان افسانوں میں اس نے کبھی ناصح مشفق بننے کی کوشش نہیں کی ہے۔ ممبر پر کھڑے ہو کر تبلیغ و تلقین کرنے کی بجائے اس نے گندی بستیوں اور چالوں کی اندھیری کھولیوں سے زندگی کے ایسے ایسے رخ نکال کر پیش کئے ہیں جنہیں اس سے پہلے کسی اور نے پیش کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ منٹو لکھتا ہے'' زمانے کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اگر آپ اس سے واقف نہیں تو میرے افسانے پڑھئے اور اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب ہے کہ زمانہ ناقابلِ برداشت ہے۔ میری تحریر میں کوئی نقص نہیں جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے وہ دراصل موجودہ نظام کا ایک نقص ہے۔ میں ہنگامہ پسند نہیں اور لوگوں کے خیالات میں ہیجان پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ میں تہذیب، تمدن اور سوسائٹی کی چولی کیا اُتاروں گا، جو ہے ہی ننگی۔ میں اسے کپڑے پہنانے کی کوشش بھی نہیں کرتا کیونکہ یہ میرا کام نہیں درزیوں کا کام ہے۔''

اگر منٹو نے سوسائٹی کی چولی نہیں اُتاری تو اسے کپڑے بھی نہیں پہنائے۔ لیکن پھر بھی وہ اردو میں پہلا ادیب ہے کہ جس نے طوائف کو عزت بخشی۔ طوائفوں کے کردار تو افسانوی ادب میں پہلے سے ہی تھے۔ مرزا ہادی رسوا کی امراؤ جان ادا تھیں کہ جو بے تکان غالبؔ اور ذوقؔ کے اشعار پڑھتی تھیں اور میرؔ و مومنؔ کا دم بھرتی تھیں۔ قاضی عبدالغفار کی لیلی تھی کہ جس کی بذلہ سنجی اور طنز آمیزی طنز نگاروں کو شرماتی تھی۔ لکھنؤ کی ایسی ڈیرہ دار طوائفوں کا شہرہ تھا کہ شرفا جن کے ہاں اپنے لڑکوں کو آداب مجلس سیکھنے کے لیے بھیجتے تھے۔ لیکن منٹو کے افسانوں کی رنڈیاں ایک عام عورت ہے کہ جس کے اندر کی عورت ابھی پوری طرح نہیں مری ہے۔ یہ ترقی پسند خیالات پر بے تکان گفتگو کرنے والی ڈرائنگ روم کی قحبہ نہیں ہے۔ منٹو کی رنڈی دیکھنے، بولنے، برتاؤ اور احساسات تک میں رنڈی ہی لگتی ہے لیکن ہے کچھ اور۔

وہ ماں بننا چاہتی ہے، وہ جانتی ہے کہ مادھو اس کے ساتھ بددیانتی کر رہا ہے۔ وہ اس

کو دھوکا دے رہا ہے لیکن وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہے۔ شانتی کولپ اسٹک سے نفرت ہے۔ سراج کی طرح اس کا انداز کاروباری بلکہ تجارتی ہے لیکن گاہک کو بے دلی کے ساتھ اپنے جسم کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی۔ جب مقبول نے پچاس روپئے دینے کے بعد بھی اس کے جسم سے کوئی دلچسپی نہیں دکھائی تو شانتی نے اس کے پیسے اسے واپس کر دیئے تھے۔ زینت کی وفاداری بیویوں جیسی ہے۔ وہ منٹو کو بھائی جان کہتی ہے۔ اسے عام طوائفوں کی طرح قیمتی کپڑوں اور زیوروں سے کوئی سروکار نہیں۔ جب منٹو نے اسے دلہن کے لباس میں دیکھ کر کہا تھا'' یہ کیا مسخرا پن ہے۔'' تو اس کے نازک دل کو چوٹ لگی تھی۔ اور شاردا تو شاید پیدائشی ماں ہے۔ جب نذیر شاردا کی ننھی منی کو اپنی گود میں لے کر کہتا ہے'' اس کی ماں تو میں ہوں۔'' تو شاردا موم کی طرح پگھل جاتی ہے۔ جانکی بھی ایک طوائف ہے۔ لیکن سعید اور عزیز کو اپنے بیٹوں کی طرح پیار کرتی ہے۔ اور ممی جو جگت ممی ہے چڈھے کی منہ بولی ماں۔ دن کترے کی ماں ڈالی۔ کنی ایلما تھسیلما کی ماں، سارے کانج کی ماں، سارے پونے کی ماں، موذیل بھی پیشہ ور طوائف ہے لیکن ہر روز بکتی ہے۔ معمولی کال گرل کی طرح وہ تھی بھی سیکس گرل، پھر بھی اس کے دل کو کوئی آلہ نہیں ناپ سکا۔

وہ یہودی لڑکی ہے لیکن ممبئی کے فسادوں میں مسلمان کے محلے سے تر لوچن سنگھ اور اس کی بیوی کرپال کور کی جان اپنی جان پر کھیل کر بچا لیتی ہے۔ موذیل منٹو کو بہت عزیز تھی۔ نسوانی کرداروں میں اسے سب سے پیاری تھی۔ منٹو عورتوں کے استحصال کے خلاف تھا۔ وہ ان کو باعزت و باوقار دیکھنا چاہتا تھا۔ موذیل، سوگندھی اور سلطانہ قحبائیں ہونے کے باوجود گناہ سے پاک ہیں۔ ان کی روحوں پر کوئی داغ نہیں پڑا ہے، ان کے دل نازک، حساس اور قابل قدر ہیں۔ سریتا میں بچوں کی سی معصومیت ہے۔ اس کی نگاہیں زندگی کا کھیل ہیں گاہک آتے ہیں تو اس کو گلی کے نکڑ پر بچوں کے ساتھ کھیلتا ہوا پاتے ہیں۔ سوگندھی دکھ سا کشات ہے۔ زفستان کی دیوی ہے۔

منٹو کے نسوانی کرداروں کے بارے میں ایک نئی بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ بدترین

حالات میں بھی ان کے اندر کی انسانیت زندہ رہتی ہے۔اس کی گری ہوئی عورتیں برناڈ شا، آسکر وائلڈ اور ڈی ایچ لارینس کے نسوانی کرداروں سے مختلف ہیں۔ برناڈ شا عورت کو مسئلہ بنا کر پیش کرتا ہے۔آسکر وائلڈ اور ڈی ایچ لارینس نسوانی نفسیات کے مطالعے تیار کرنے کی سعی کرتے ہیں۔مگر منٹو اس عورت کے دکھ اور تنہائی کو مٹانا چاہتا ہے کہ جو سماج کی نگاہ میں گر چکی ہے۔وہ اس میں انسانی کردار کی بلندیاں اور تنوع تلاش کرتا ہے۔

منٹو اردو افسانے کا پرومیتھیس ہے۔ پرومیتھیس زمین کے لیے دیوتاؤں کے بیچ سے آگ چرا لایا تھا اور سخت عقوبت میں گرفتار رہوا۔منٹو نے اردو افسانہ کو روشنی اور توانائی دی اور مصائب کا حقدار رہوا۔منٹو نے ان عورتوں کی مانند کہ جو جنگلوں سے لکڑیاں اور ریل کی پٹریوں سے کوئلے چنتی ہیں،اپنی جھولی میں ایسے نسوانی کرداروں کو ذخیرہ کیا ہے کہ جو آتش گیر مادے کی صورت ننھی چنگاری سے بھڑک اُٹھتے ہیں اور دھماکے کرتے ہیں۔

بعض نام نہاد ترقی پسند ادیبوں نے منٹو کی عورت کا دوستوفسکی کے نسوانی کرداروں سے مقابلہ کرنے کی سعی کی ہے۔مگر یہ کوشش بے نتیجہ رہی۔اس کے کردار جاگتی زندگی کو آئینہ دکھاتے ہیں۔منٹو بہت باشعور ادیب تھا اور شعور مندی ایسا گناہ ہے کہ جس کی سزا ضرور بھگتنی پڑتی ہے۔

منٹو نے اس دور میں شعور مندی کا حوصلہ کیا کہ جب یہ آگ سے کھیلنے کے مترادف تھا۔اس نے پامال مگر محفوظ راستوں سے روگردانی کر کے اردو افسانہ میں اپنے لیے خود راستہ بنایا۔اس نے زندگی میں سیڑھیاں اور سہارے کبھی تلاش نہیں کیں۔نرس مس فریاد کو لیجئے جو لوہے کی چارپائی پر بیٹھ کر اپنے آنسو پونچھتی ہے۔جو سفید ساڑیوں سے تنگ آ گئی ہے۔اس کی زندگی میں جتنے ’مریض‘ آئے وہ زندگی سے محبت کرنا چاہتے تھے۔لیکن مس فریاد محبت میں زندگی کی خواہاں تھی۔

اس نے سعید کی ہسپتال میں دل کھول کر خدمت کی تھی۔جیسے ننھے مُنّے بچے کا کوئی خیال رکھتا ہو،وہ اسی طرح سعید کا خیال رکھتی تھی۔اور جب وہ ہسپتال سے جا رہا تھا تو وہ اسے

اس کو ایسے رخصت کر رہی تھی جیسے ماں بچے کو اسکول بھیجتی ہے اور اس کے دروازے سے باہر نکلنے تک کبھی اس کی ٹوپی ٹھیک کرتی رہتی ہے یا کبھی اس کی قمیض کے بٹنوں کو بند کرتی رہتی ہے۔ شاردا بھی ماں بننا چاہتی ہے۔اس نے سوچا، ماں بننا کتنا اچھا ہے۔ مرد کھا پی کر سب ہضم کر جاتے ہیں۔عورتیں کھاتی ہیں تو کھلاتی بھی ہیں۔ کسی کو پالنا اپنے بچے کو ہی کتنی شاندار چیز ہے۔شیلا بنارسی ساڑی میں خالی بوتل نہیں بلکہ ماں کی تصویر ہے۔فن اور فنکار کے بیچ کچھ تو فنی فاصلہ رہنا چاہئے۔

منٹو کے لیے ہر عورت ماں کی قائم مقام ہے۔اس کے کردار جب نفسیاتی زاویے سے دیکھے جاتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منٹو مادر وابستگی کا شکار نہیں بلکہ اس کا پرستار ہے۔ فلمی دنیا اور بالا خانوں میں متواتر جانے کے بعد بھی منٹو کی پاکبازی ایک حقیقت ہے۔گھاٹن لڑکی کی بغلوں کے بالوں سے رندھیر کو گھن نہیں بلکہ عجیب قسم کی تسکین کا احساس ہوتا ہے۔ مادر وابستگی کے پس منظر میں منٹو کی نام نہاد فحش نگاری بالکل جعلی معلوم ہوتی ہے۔منٹو اردو ادب کا ققنس کہا جا سکتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ ققنس وہ بے نظیر پرندہ ہے جس کا کوئی ہمسفر نہیں ہوتا۔اس کی عمر ہزار سال ہوا کرتی ہے جس کے پورے ہونے پر وہ بہت سی سوکھی لکڑیاں جمع کرتا ہے اور ان پر بیٹھ کر عالمِ سرمستی میں ایک عجیب وغریب راگ چھیڑتا ہے۔اپنی منقار سے ان گنت سُر اور راگ نکالتا ہے اور اپنے پروں کو بے خودی کے عالم میں ہی پھڑ پھڑاتا ہے۔ اور جس وقت وہ دیپک راگ پر پہنچتا ہے تو راگ کی حدت سے یکا یک ان لکڑیوں میں آگ لگ جاتی ہے جس میں جل کر ققنس بھی راکھ ہو جاتا ہے۔ پھر جب مینہ برستا ہے تو وہ راکھ ایک انڈے کی شکل اختیار کر لیتی ہے جس میں سے کچھ مدت کے بعد از خود ایک ققنس پیدا ہوتا ہے۔

منٹو نے بھی اسی طرح اپنی کہانیوں کی شکل میں اپنے لیے لکڑیاں اکٹھا کیں اور فکروفن کے راگ سے اس میں ایسی آگ لگائی جس میں جل کر خود اسے ہزار سالہ زندگی مل گئی ہے۔ یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ منٹو جیسا بلانوش اپنی آخری زندگی میں شراب کے بارے میں ایسے دلکش انداز میں بھی سوچ سکتا تھا۔ کہتے ہیں کہ شراب پی نہیں پلائی جاتی ہے۔منٹو نے جب

پہلی دفعہ شراب کو منہ لگایا تھا تو دوستوں کے اصرار پر پی تھی۔ پھر دوست اس کے اصرار پر پینے لگے۔ اور پھر ایک ایسا دور آیا کہ اس نے محسوس کیا کہ شراب نے اس کا جسم کمزور اور مُردہ کر دیا ہے۔ مگر اس کا ضمیر زندہ رہا۔ جو اسے ملامت کرتا تھا۔ اس کے کانوں میں پکارتا تھا کہ وہ ''شرابی'' ہے۔ دوست، رشتے دار اس سے دور بھاگنے لگے۔ سوسائٹی نے اسے ذہنی اپاہج بنانے کی پوری کوشش کی۔ لیکن منٹو کبھی پی کر بیہوش نہیں ہوا تھا۔ کبھی کسی نالی میں نہیں گرا تھا۔ آخری دم تک وہ پورے ہوش میں تھا۔ منٹو ایک مزدور تھا۔ وہ شراب شاید اس لیے پیتا تھا کہ ہر مزدور شراب پیتا ہے۔ گورکی کے مزدوروں کی طرح جو دن بھر کی مشقت سے چور چور ہو کر کسی عارضی لذت کے خواہاں ہوتے ہیں۔ وہ شراب کیوں پیتے ہیں، اس جواب کے لیے گورکی کے اپنے الفاظ موجود ہیں:

''سالہا سال کی جمع شدہ تھکاوٹ نے ان کی بھوک چھین لی تھی۔ کچھ کھا سکنے کے لیے وہ شراب نوشی کرتے ہیں۔ اپنے کمزور معدوں سے کام لینے کی خاطر وہ درد کا جھلس دینے والا چابک استعمال کرتے ہیں۔''

منٹو بلا نوش ہونے کے باوجود ایک صاف ستھری زندگی بسر کرتا تھا۔ اس نے اپنے ضمیر میں کبھی کوئی خم نہیں آنے دیا۔ اس کی رندی میں بھی ایک انداز تھا۔

پروفیسر صادق

اُردو کی اوّلین نثری نظم اور منٹو

''تحقیق میں کبھی کوئی حرف آخر نہیں ہوتا۔''

یہ نکتہ میرے زمانۂ طالب علمی ہی میں اُستادوں نے اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا تھا۔ ایک استاد محترم ترکی زبان کے ماہر تھے۔ اُنہوں نے ترکی، فارسی اور اُردو کی ادبی تاریخوں سے کئی مثالیں پیش کی تھیں۔ دوسرے استاد محترم نے فارسی، اُردو اور دکنی کے علاوہ انگریزی ادب سے مثالیں دے کر اس نکتے کی خوب وضاحت کی تھی جس کے نتیجے میں یہ ہیچ مدان اس قابل ہوا کہ دہلی میں جب محترم رشید حسن خاں نے اپنے مخصوص انداز میں آنکھیں گھما کر ازراہِ کرم یہی نکتہ سمجھانا چاہا تو احقر کی زبان سے کئی ایسی مثالیں سن کر حیران رہ گئے جن سے موصوف کے کان نا آشنا تھے۔ جوشِ جواب میں سنسکرت کی مثال بھی نوکِ زبان پر جو آ گئی تھی۔

یہ بات یوں یاد آئی کہ اس وقت راقم نے منٹو کی شاعری پر لکھنے کے لیے قلم اُٹھایا ہے اور اس ضمن میں منٹو کی ایک نثری نظم نذر قارئین کرنا چاہتا ہے جو منٹو کے ایک مضمون سے حاصل ہوئی ہے۔ اس نظم کی بنیاد پر اسے اردو کی اولین نثری نظم نگار قرار دیا جا سکتا ہے۔ دعویٰ ہمیشہ دلیل کا مطالبہ کرتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اردو زبان میں نثری نظم کے آغاز پر بھی ایک نظر ڈالی جائے۔ ہر چند کہ یہ ہمارے ماضی قریب کی بات ہے اور اس نوخیز صنف نے اُردو ادب میں اب تک وقار و اعتبار بھی حاصل نہیں کیا ہے۔ تاہم گذشتہ پچاس برسوں میں نثری نظم کے بانی مبانی ہونے کا سہرا وقتاً فوقتاً کئی سروں پر باندھا جا چکا ہے۔

میں اُردو کے اوّلین نثری نظم نگار ہونے کا دعویٰ کرنے والے مؤخرین سے صرفِ نظر کر کے، چھٹی دہائی میں منظر عام پر آنے والی ایک کتاب کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ کتاب کا نام ہے 'پگھلا نیلم' جو منٹو کے ہم عصر فکشن نگار اور ترقی پسند تحریک کے قائد سجاد ظہیر کی شعری تخلیقات

کا مجموعہ ہے جس میں صوتی آہنگ کو ملحوظ رکھ کر لکھی گئی نظموں کے ساتھ ساتھ چند ایسی نظمیں بھی شامل ہیں جو نثر میں ہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ نثری نظمیں ہیں۔ ان نظموں کو لکھتے وقت سجاد ظہیر کے ذہن میں نثری نظم کا کوئی واضح تصور موجود نہیں تھا۔ لہٰذا اُنہوں نے مصنفانہ منصفی سے کام لیتے ہوئے اس حقیقت کا برملا اظہار بھی کر دیا تھا:

''میری ان تخلیقات میں شعریت تو ہے لیکن ان کی نوعیت ماقبل دور میں، 'ادبِ لطیف' نام سے لکھی جانے والی نثر کی سی ہے۔ انہیں نظم نہیں کہنا چاہیے۔''

یہ ۱۹۶۴ء کی بات ہے، اس کے کچھ عرصہ بعد جب اُردو میں جدیدیت کا شور وغل بلند ہوا اور نثری نظم کے چرچے ہونے لگے تو تیسرے درجے کے ترقی پسند نقادوں نے 'پگھلا نیلم' کی مذکورہ نظموں کو اُردو میں نثری نظم کے اوّلین نمونے قرار دینے کے معاملے میں بڑی مستعدی دکھائی جب کہ نثری نظم کی 'وافی' شناخت نہ ان کے بس کی چیز تھی اور نہ ہی ان کے قارئین کی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس عہد کے نثری نظم نگار خود بھی اس میدان میں ٹامک ٹوئیے ہی مار رہے تھے۔ اُردو کے عصری رسائل وجرائد میں آئے دن چھپنے والی نثری نظمیں پڑھ کر لگتا ہے کہ بیشتر لوگ آج بھی یہی کر رہے ہیں۔

اگر سعادت حسن منٹو کے عہد میں نثری نظم نگاری کا آغاز ہوا ہوتا تو وہ یقیناً یہی کہتا کہ یہ کیا فراڈ ہے؟ لفظ 'فراڈ' اس کا تکیہ کلام نہیں تھا۔ کیونکہ منٹو نے اس لفظ کا استعمال کبھی بے محل نہیں کیا جب کہ گالیاں دینے کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔

سجاد ظہیر کی نظموں کا مجموعہ 'پگھلا نیلم' ۱۹۶۴ء میں منظرعام پر آیا۔ اس دہائی (۱۹۶۰ء تا ۱۹۷۰ء) میں ترقی پسند تحریک کا بھٹہ بیٹھ رہا تھا اور ایک نیا بھٹہ تیار ہو رہا تھا جو جدیدیت کے میلان سے عبارت ہے۔ اسی اثنا میں اُردو میں 'نثری نظم' کی اصطلاح وجود میں آئی۔ خدا نے جنہیں 'کارِ تحقیق' کے ساتھ ساتھ 'خوئے جستجو' بھی عطا کی ہے وہ چھٹی دہائی میں شائع شدہ سجاد ظہیر اور حسن شہیر کی کتابوں کے علاوہ اس زمانے کے ادبی رسائل (اقدار، شب خون، انتخاب اور شعر و حکمت وغیرہ) میں احمد ہمیش اور راقم الحروف کی نثری نظموں کے ابتدائی نمونے

تلاش کر سکتے ہیں۔

ایک بار خلیل الرحمٰن اعظمی نے طویل ادبی گفتگو کے دوران یہ بات بتائی تھی کہ ۴۹-۱۹۴۸ء میں ممبئی کے ایک ادبی رسالہ 'خیال' میں بسنت سہائے نامی کسی شخص کی چند نثری نظمیں شائع ہوئی تھیں۔ دورانِ گفتگو خلیل صاحب نے اس قیاس کا اظہار بھی کیا تھا کہ یہ نظمیں میراجی کی ہو سکتی ہیں۔

'خیال' میں شائع شدہ بسنت سہائے کی نثری نظمیں رسالہ مذکور کے فائلوں میں دفن ہیں۔ وہ کہیں اور نقل نہیں ہوئیں۔ اگر ہوئی بھی ہوں تو اب تک میری نظروں سے نہیں گزریں۔ اس لیے ان کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بسنت سہائے فرضی نام بتایا گیا ہے۔ وہ نظمیں میراجی کی ہوں گی یہ محض قیاس ہے۔ مسئلہ تحقیق طلب ہے تاہم خلیل الرحمٰن اعظمی کے بیان پر اعتبار کر کے یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ان نظموں کا خالق بسنت سہائے (یا اسی نام کے پردے میں میراجی) ہے۔ مبیّنہ نثری نظمیں 'خیال' ۴۹-۱۹۴۸ء کے کسی شمارے میں شائع ہوئی تھیں۔

آج یہ نظمیں دستیاب نہیں لیکن دستیاب ہو جائیں تو بھی بسنت سہائے یا اس کے نام کے پردے میں جو بھی ہو اسے اُردو کا پہلا نثری نظم نگار تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ رسالہ 'خیال' کے اجرا سے چند برس قبل ممتاز افسانہ نگار سعادت حسن منٹو نثری نظم لکھنے کا تجربہ کر چکا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ منٹو نے یہ نظم 'زندگی' نامی ایک فلم پر تبصرہ کرتے ہوئے قلم بند کی تھی۔ یہ تبصرہ 'منٹو کے مضامین' نامی کتاب میں بھی دیکھا جا سکتا ہے جو ۱۹۴۲ء میں پہلی بار لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ نظم ملاحظہ ہو:

بلوری چوڑیوں نے کھنکھناہٹ سے پوچھا:
"میں خوب صورت ہوں کہ تو؟"
عود کا دھواں آگ کے بستر سے پریشان ہو کر اُٹھا
ہوا میں سانپ کی طرح اس نے بَل کھا کر کہا:
"تو میرے سینے کا راز ہے یا میں؟"

فرشتے آسمان کی ہلکی پھلکی فضاؤں میں پر تول کر رہ گئے
ابر بہار نے خزاں کی مٹھی کھولی اور بلند درختوں سے سرگوشیاں شروع کر دیں
طلوع آفتاب کی آڑی ترچھی کرنوں کے شعور سے
اندھیرا گھبرا کر اُٹھا اور بھاگ گیا
گاگر نے چھلکتے ہوئے پانی سے کہا:
''تو اتنا بے صبر کیوں ہے؟''
گھونگھٹ کے نیچے ایک کنوارے چہرے پر
نہ معلوم کتنے رنگ آئے اور چلے گئے
سوسن کے پھولوں میں شہد کی بھوری مکھیاں پڑی اونگھتی رہیں
آسی شبنم کی بوندوں کی مانند اس کے دل پر ٹپک رہی تھی
دروازے نے ہولے سے آہ بھری اور دہلیز کے ساتھ بغل گیر ہو گیا،
تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں پر ایک کپکپی منجمد ہوتے ہوتے رہ گئی،
اس نظم کے بارے میں خود منٹو لکھتا ہے:

''یہ نثر کی شاعری کا ایک نہایت ہی لطیف نمونہ ہے۔ چند سطروں میں زندگی کا تمام رَس نچوڑ کر بھر دیا گیا ہے۔ پہلی سطور میں تصوف کا رنگ ہے۔ بلوری چوڑیوں کا اپنی کھنکھناہٹ سے پوچھنا '' میں خوبصورت ہوں کہ تو ؟'' کتنا اچھوتا خیال ہے اور تصوف کے چہرے پر سے یہ نقاب کو کس دل کش انداز سے اُٹھاتا ہے۔ شاعر کا سینہ قدرت کی رنگینیوں سے معمور ہے۔ وہ فرشتوں تک پہنچتا ہے مگر فوراً ہی زمین پر ابرِ بہار اور بلند درختوں کی سرگوشیاں سننے کے لیے دوڑ آتا ہے۔

نیچریت کا ایسا اچھا نمونہ ہندوستانی شاعری میں مِلنا محال ہے اور ان کی قید سے آزاد یہ منثور نظم دیہاتوں میں چلنے والی ہوا کے مانند ہلکی پھلکی اور معطر ہے۔ اس میں زندگی ہے

اوراس زندگی کے اندر حرکت ہے۔ایک لطیف حرکت،ایک پیاراارتعاش ہے۔ایساارتعاش جو کنواری لڑکیوں کے جسم پر طاری ہوا کرتا ہے۔

الفاظ کی نشست و برخاست بہت اچھی ہے۔موزونیت بھی نہایت عمدہ ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم منثور کے مصنف نے دُلہن کی ساڑی میں تارے بڑے احتیاط سے ٹانکے ہیں ہر ایک لفظ چمکتا ہے لیکن یہ چمک خیرہ کن نہیں، آنکھوں کو کھلتی نہیں بہت پیاری معلوم ہوتی ہے۔"

منقولہ تینوں پیراگراف میں سعادت حسن منٹو نے اپنی نظم کی تعریف میں جو باتیں بیان کی ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ یہ نثر کی شاعری کا ایک نہایت ہی لطیف نمونہ ہے۔

۲۔ چند سطروں میں زندگی کا رَس نچوڑ کر بھر دیا گیا ہے۔

۳۔ ابتدائی سطروں میں تصوف کا رنگ ہے۔

۴۔ اس میں اچھوتا خیال ہے۔

۵۔ نظم نگار کا سینہ قدرت کی رنگینیوں سے معمور ہے۔

۶۔ نیچریت کا ایسا اچھوتا نمونہ ہندوستانی شاعری میں مِلنا محال ہے۔

۷۔ اس میں زندگی ہے اوراس زندگی کے اندر حرکت ہے۔

۸۔ الفاظ کی نشست و برخاست بہت اچھی ہے۔

۹۔ موزونیت بھی نہایت عمدہ ہے۔

اتنی خوبیوں کی حامل اس منثور نظم کے بارے میں منٹو کی لکھی ہوئی چند باتوں کو دہرانے کے بعد اب اسی مضمون کے دو اگلے پیراگراف قارئین کی نذر ہیں، ملاحظہ ہوں:

"اس نظم پر اسی طرح اور بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ ہر ایک لفظ کے کئی کئی معنی نکالے جا سکتے ہیں۔مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ نظم منثور محض دماغی عیاشی ہے۔ لکھتے وقت اس کے مصنف کے پیشِ نظر صرف یہ بات تھی کہ لفظ خوبصورت

ہوں اور ان کی ترتیب بھی سُندر ہو، مگر مطلب کچھ نہ ہو، چنانچہ یہ نظم پڑھنے
کے بعد مزہ تو آ جائے گا مگر مطلب ہرگز ہرگز سمجھ میں نہیں آئے گا۔ کیونکہ یہ
اس غرض سے لکھی ہی نہیں گئی۔

یہ نظم میں نے لکھی ہے اور اس پر میں نے صرف دو منٹ صرف کیے ہیں۔
ہندوستانی ادب میں اب ایسی نظموں کا فیشن عام ہو گیا ہے۔ یورپ کا لٹریچر
چونکہ بہت وزنی ہو چکا تھا اس لیے لوگوں نے اس قسم کی ہلکی پھلکی منثور
شاعری کی طرف توجہ دی اور یورپ کا قاری جو کہ بوجھل افکار سے تنگ آ چکا
تھا ایسی نظموں کا دلدادہ ہو گیا۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ یوروپی لٹریچر میں یہ 'ادب
لطیف' داخل ہو گیا۔ ہندوستان چونکہ تقلید کا شروع سے عادی ہے اس لیے
اس کے ادب نے اس نئی قسم کی شاعری کو قبول کر لیا۔''

منقولہ نظم کے بارے میں منٹو نے جملہ پانچ پیراگراف لکھے ہیں جن میں سے پہلے
تین میں اس نظم کے فنی اور فکری محاسن بیان کیے ہیں اور بقیہ دو اس کی تنقید و تنقیص پر مشتمل
ہیں۔ اگر ہم اس دور کے ادبی رسائل کا مطالعہ کریں تو پائیں گے کہ اس دور کے ناقد و مبصرین
جدید نظموں کی موافقت و مخالفت میں عموماً اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا کرتے تھے۔ اس دور
کی شعری تنقید میں یہی دو رویّے کارفرما نظر آتے ہیں۔

سعادت حسن منٹو نہ تو آئینِ نو سے ڈرنے والوں میں تھا نہ ہی طرزِ کہن پر اَڑنے
والوں میں۔ اس کا موقف بالکل واضح نظر آتا ہے۔ وہ ایسی شاعری کو لایعنی قرار نہیں دیتا
(کیونکہ اس کے نزدیک اس نظم پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے اور ہر لفظ کے کئی کئی معنی نکالے
جا سکتے ہیں) بلکہ فیشن زدہ اور تقلیدی کہہ کر اسے دماغی عیاشی قرار دیتا ہے۔

اس نثری نظم کی تنقید و تنقیص کو ن۔ م۔ راشد اور منٹو کے درمیان جاری سرد جنگ
سے جوڑ کر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر مجھے تو قرین اصلیت یہی معلوم ہوتا ہے کہ منٹو ایک حقیقت
پسند فنکار تھا۔ کسی بات کو سات پردوں میں چھپانا اس کی سرشت کے خلاف تھا۔ وہ تو ہر جگہ کھل

کر کھیلنے کا قائل تھا۔اس کے برعکس نظم جدید کا ابہام وعلائم سے خونی رشتہ تھا۔ظاہر ہے کہ ایسی نظمیں منٹو ایسے حقیقت نگار فنکار کو خوش نہیں آ سکتی تھیں۔

اس نثری نظم سے پہلے بھی منٹو دو مختصر نظمیں لکھ چکا تھا جو کہ اس عہد کی عام روش کے مطابق صوتی آہنگ کو ملحوظ رکھ کر نظم آزاد کی ہیئت میں لکھی گئی تھیں۔منٹو کے ایک ریڈیو ڈرامے 'نیلی رگیں' کا آغاز اور 'اختتام' ان ہی نظموں سے کیا گیا ہے۔پہلی نظم یہ ہے:

مرمریں پیکر پہ نیل کے خطوط
سرد ہے دنیائے خواب
میرے برفانی تصور میں مگر
بہہ رہا ہے نیلگوں سیلاب سا
جس طرح جاری ہو قلب وروح میں
اک حسیں افعی کا زہر
چاندنی میں جس طرح نیلی شعاعوں کی جھلک
مرمریں پیکر پہ نیلم کے خطوط....

ڈرامہ 'نیلی رگیں' کا اختتام جس آزاد نظم پر کیا گیا ہے وہ منٹو کی ہدایات کے مطابق دھیمے سروں میں بجتے ہوئے ساز کی لے پر درد بھری آواز میں پیش کی گئی تھی۔نظم یہ ہے:

موج سی پانی میں اک پیدا ہوئی
بہہ گئی
جیسے اک جھونکا ہوا کا
پاس سے ہو کر نکل جائے کہیں....
چندروزہ آرزوؤں کا چراغ
جھلملا کر بجھ گیا۔

احمد ندیم قاسمی کے نام ستمبر ۱۹۴۰ء میں لکھے گئے منٹو کے ایک خط میں بھی ایک خام

نثری نظم ملتی ہے۔ منٹو نے یہ نظم (اگر اسے نظم کہا جائے) احمد ندیم قاسمی کو اپنا مافی الذہن سمجھانے کے لیے لکھی تھی تا کہ قاسمی اسے پیش نظر رکھ کر ایک خاص فلمی سچویشن کے مطابق اچھا سا گیت لکھ سکے۔ واضح رہے کہ منٹو نے اپنی اس تحریر کو نظم کہنے سے عمداً گریز کیا ہے جب کہ 'نیلی رگیں' اور 'زندگی' میں پیش کیے گئے فن پاروں کو بجا طور پر نظم کہا ہے۔ منٹو نے قاسمی کو لکھا تھا کہ میں شاعر نہیں۔ اسی لیے میں آپ کو ٹھیک طور پر سمجھا نہیں سکتا۔ میں نثر میں کچھ اس طرح کہتا:

نیند کی ایک پری اپنے ہلکے پھلکے پروں پر اُڑتی آئے
اور تیری آنکھوں کے پیمانوں میں نیند کی شراب اُنڈیل دے
حُسن جب سو جائے تو زیادہ حسین ہو جاتا ہے
تارے کرنوں کے سہارے چھم چھم کرتے نیچے اُتر آئیں
چاند ڈھولک بجائے اور تو سو جائے
آنکھیں مُند جائیں تو دل سیر کے لیے نکلتا ہے
تیری پلکوں پر شاعر کے سپنے سوئیں
مصوّر کی تمنائیں انگڑائیں لیں

بلا شبہ منٹو شاعر نہیں۔ شاعر ہونے کا مدعی بھی نہیں۔ اسے شاعری کے وزن و بحور کا علم نہیں تھا۔ علم عروض سے بھی واقفیت نہیں تھی، لیکن جب اس نے پہلی مرتبہ پیرایۂ نظم میں کچھ لکھنے کی سعی کی تو صوتی آہنگ کو ملحوظ رکھ کر دو آزاد نظمیں موزوں کر دیں اور دوسری بار ایک نثری نظم۔ یہ نظم اس نے سنجیدگی کے ساتھ لکھی ہو یا غیر سنجیدگی سے۔ وہ جدید شاعری یا نظم آزاد کا حمایتی تھا یا مخالف۔ اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے ایک نثری نظم تخلیق کی تھی جو اب تک کی حاصل شدہ معلومات کے مطابق اُردو زبان میں لکھی جانے والی اوّلین نثری نظم قرار دی جا سکتی ہے اور منٹو ہمارا پہلا نثری نظم نگار۔

☆☆☆

پروفیسر علی احمد فاطمی

منٹو کی حقیقت نگاری۔ چند اشارے

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اُردو کے افسانوی ادب میں منٹو کا نام بڑا انوکھا، نرالا اور ہیجان انگیز ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ منٹو وہ فنکار ہے، افسانہ نگار ہے جسے تقریباً ہر طبقۂ فکر نے پڑھا رَد کیا اور قبول بھی کیا۔ گالیاں دیں اور پھر گلے سے بھی لگایا۔ حد یہ کہ ابتدا میں چوری چھپے اور اب تو کھلے عام اس اشرافیہ طبقہ نے بھی پڑھ کر چٹخارے لیے جو کبھی منٹو کی جنسیت اور فحاشی کے شدید شاکی اور مخالف ہوا کرتے تھے۔ جنس زدگی کے حوالے سے تو بعض ترقی پسندوں نے بھی اسے راندۂ درگاہ کرنا چاہا جو روشن خیالی اور حقیقت نگاری کا دم بھرتے ہیں لیکن وقت نے بڑی حد تک یہ فیصلہ کر دیا کہ آج پریم چند کے بعد منٹو سے زیادہ بڑا حقیقت نگار کوئی افسانہ نگار نہیں سمجھا جاتا، شاید ترقی پسندوں میں بھی نہیں۔ حالانکہ میں منٹو کو اس سے الگ کر کے دیکھ نہیں پاتا۔

غریبی مفلسی کا ذکر کرنا، گھیسو، مادھو، کالو بھنگی جیسے کھردرے، بے آب و رنگ کرداروں میں رنگ بھرنا یقیناً جرأت مندانہ قدم ہے۔ اس سے بلاشبہ اردو افسانہ میں کردار سازی اور حقیقت نگاری کے متعدد پہلو اُجاگر ہوئے لیکن منٹو کی حقیقت نگاری دو قدم اور آگے کی ہے، اس نے نہ صرف دل خراش اور واشگاف حقیقتیں پیش کیں بلکہ حقیقت نگاری کے تعلق سے نئے نئے سوالات کھڑے کر دیے۔ نئی نئی اُلجھنیں اور ساتھ ہی کچھ ندامتیں بھی لیکن یہ بھی ہوا کہ انہیں حوالوں سے حقیقت نگاری کے نئے نئے پہلوؤں نے جنم لیے۔ پہلو در پہلو جو منٹو کے علاوہ کوئی اور نہ دے سکا۔ شاید اس لیے کہ منٹو کے افسانے بند ھے ٹکے انداز کے اصول و نظریات کی پابندی نہیں کرتے بلکہ پورے فطری پن اور فنکارانہ انداز کے ساتھ فرد اور معاشرہ کو نہ صرف پیش کرتے ہیں بلکہ برہنہ بھی کرتے ہیں۔ منٹو کا فن اور اس کا

ذہن اس خیال پر یقین نہیں کرتا کہ معاشرہ کی رفو گیری کی جائے۔ وہ نقاب کشائی ہی نہیں بلکہ چیرہ دستی اور سفاک حقیقت کی پیشکش پر یقین رکھتا ہے اور یہیں سے وہ بعض دوسرے اہم ترقی پسند افسانہ نگاروں سے الگ ہو جاتا ہے۔ اس الگاؤ و اختلاف کو قدرے نزاکت اور گہرائی سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

منٹو نے جنسیات پر افسانے لکھے

منٹو نے فسادات پر افسانے لکھے

عام خیال ہے کہ یہ دونوں موضوعات ہی منٹو کے محبوب موضوعات ہیں لیکن یہ بات پورے طور پر سچ نہیں ہے۔ منٹو نے حیات و معاشرہ کے نازک و پامال موضوعات کو من و عن پیش کرنے کی کوشش کی۔ ان واقعات و افراد تک اپنے آپ کو پہنچانے کی کوشش کی جہاں مہذب سماج کی نظریں نہیں پہنچ سکیں۔

یہاں میں منٹو کے مشہور افسانہ ''بابو گوپی ناتھ'' کا ذکر بطور خاص کرنا چاہوں گا۔ ہر چند کہ اس افسانہ پر خوب سوچا اور لکھا جا چکا ہے۔ اردو کے ممتاز اور بالغ نظر نقاد وارث علوی نے تو اس افسانہ پر ایک نہیں دو دو ایسے مضامین لکھ دئے کہ اس کے آگے جانا ممکن نہیں تاہم اس افسانہ کا انتخاب ایک مجبوری ہے، کیوں کہ یہ منٹو کا وہ مشہور افسانہ ہے جس پر براہِ راست نہ فحاشی ہے نہ فساد۔ منٹو کی اس کہانی کا ایک اہم کردار عبد الرحیم سینڈو نے منٹو کا تعارف کراتے ہوئے لکھا تھا:

''بابو گوپی ناتھ تم ہندوستان کے نمبر ون رائٹر سے ہاتھ ملا رہے ہو۔ لکھتا ہے تو دھڑن تختہ ہو جاتا ہے۔ ایسی کنٹی نیوٹی ملاتا ہے کہ طبیعت صاف ہو جاتی ہے۔''

دھڑن تختہ، کنٹی نیوٹی، اینٹی کی پنٹی پو جیسے الفاظ محض لطف لینے یا چونکانے کے لیے نہیں بلکہ اس پھکڑ فرد اور معاشرہ کی نمائندگی کرتے ہیں جہاں سینڈو جیسے چاپلوس و عیاش طبع لوگ رہتے ہیں بظاہر ان الفاظ کے معنی کچھ نہ ہوں لیکن منٹو کی ذہانت و شرارت بہ الفاظ دیگر خلاقیت نے نہ صرف دلچسپی بلکہ حقائق کی تلخی بھی پیوست کر دی۔ یہی سینڈو

بابو گوپی ناتھ کا تعارف یوں کراتا ہے:

''آپ ہیں بابو گوپی ناتھ، بڑے خانہ خراب، لاہور سے جھک مارتے مارتے ممبئی تشریف لائے ہیں۔ ساتھ میں کشمیر کی ایک کبوتری ہے۔''

یہی نہیں بلکہ چالاک سینڈو یہ بھی کہتا ہے:

''نمبر ون بیوقوف ہوسکتا ہے تو وہ آپ ہیں، لوگ ان کے مسکا لگا لگا کر روپیہ بٹورتے ہیں۔ بڑے اینٹی فلوجسٹین قسم کے آدمی ہیں۔''

کہانی کی ابتدا میں عبدالرحیم سینڈو، غفار سائیں، غلام علی جیسے کردار کی آمد و اظہار زور و شور سے ہوتا ہے۔ لیکن خاموش بظاہر بیوقوف گوپی اپنے ٹکڑوں ٹکڑوں میں ہوئے تعارف کے ساتھ عجیب و غریب انداز سے قاری کے ذہن میں داخل ہوتا ہے اور یہی منٹو کا فن ہے کہ وہ حقیقت کو راست انداز میں کم قسطوں میں کہیں لطیف پیرائے میں کہیں کھردرے انداز میں پیش کرتا ہے اور کہیں یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ دونوں طریقۂ فن باہم کچھ اس انداز سے مُدغم اور متصادم ہوتے ہیں کہ فرد اور معاشرہ کے متضاد پہلو ایک عجیب برہنہ شکل میں کبھی پرکیف اور کبھی دلآزار صورت میں نمو پزیر ہوتے ہیں اور اس طرح غور و فکر کا سیلاب اُمڑنے لگتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سیلاب میں کھارا پن اور تیزابیت زیادہ ہوتی ہے۔ پھر زینت کا کردار آتا ہے۔ کشمیر کی ایک پختہ نائکہ کی بھولی بھالی معصوم سی لڑکی، الھڑ اور ناتجربہ کار اور پھر سردار بیگم یعنی سینڈو کی بیگم، شادی شدہ، تجربہ کار لیکن منٹو کی زبان میں اس کی آنکھیں سُرخ تھیں اور اس سے بے حیائی مترشح تھی جس کی وجہ سے اس کا شوہر اسے ٹِمن بیوٹی کہتا ہے۔ اس کی کہانی میں منٹو بھی ہیں ایک الگ انداز میں۔ خاموش، تماشائی اور معنی خیز بات یہ ہے کہ وہ سردار بیگم کے نہیں بلکہ زینت کے منہ بولے بھائی بنتے ہیں۔ ان دلچسپ مکالموں اور کرداروں کی بھیڑ میں بابو گوپی ناتھ اپنی خاموش حرکتوں سوسو کے نوٹوں سے اپنا تعارف خود کراتا ہے۔ گوپی ناتھ کے باپ اس کے لیے دس لاکھ روپے چھوڑ گئے ہیں لیکن گوپی واقعی خانہ خراب ہے۔ لاہور کی تمام طوائفوں سے کنٹی نیوٹی رہ چکی ہے۔

زینت بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے لیکن وہی عیاش بدکردار گوپی زینت کی شادی شریف و معقول مرد سے کروادینا چاہتا ہے۔اس کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا ہے۔ موٹر بھی، مکان بھی، گوپی ناتھ کا یہ جذبہ منٹو کو حیران کرتا ہے لیکن گوپی ناتھ جو بڑی معصومیت سے کہتا ہے۔

''منٹو صاحب! میں نے آج تک کسی کا مشورہ نہیں لیا۔ جب بھی مجھے کوئی رائے دیتا ہے میں کہتا ہوں سبحان اللہ۔ وہ مجھے بیوقوف سمجھتے ہیں لیکن میں ان کو عقل مند سمجھتا ہوں اس لیے کہ کم از کم ان میں اتنی عقل تو تھی جو مجھ میں ایسی بیوقوفی کو شناخت کرلیا جن سے ان کا اُلو سیدھا ہوسکتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں شروع سے فقیروں اور کنجروں کی صحبت میں رہا ہوں۔ مجھے ان سے کچھ محبت سی ہوگئی ہے۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے سوچ رکھا ہے کہ جب میری دولت ختم ہوجائے گی تو میں کسی تکیے میں جا بیٹھوں گا۔ رنڈی کا کوٹھا اور پیر کا مزار بس یہ دو جگہیں ہیں جہاں میرے دل کو سکون ملتا ہے۔ رنڈی کا کوٹھا تو چھوٹ جائے گا اس لیے کہ جیب خالی ہونے والی ہے لیکن ہندوستان میں ہزاروں پیر ہیں، کسی ایک مزار پر چلا جاؤں گا۔''

میں نے پوچھا:

''رنڈی کے کوٹھے اور تکیے آپ کو کیوں پسند ہیں؟''

کچھ دیر سوچ کر اس نے جواب دیا:

''اس لیے کہ ان دونوں جگہوں پر فرش سے عرش تک دھوکہ ہی دھوکہ ہوتا ہے جو آدمی خود کو دھوکہ دینا چاہے اس کے لیے ان سے اچھا مقام کیا ہوسکتا ہے۔''

ایک طرف پُغد اور اوباش کردار کا یہ رخ دیکھئے اور دوسری طرف اسی کہانی کا ایک اور کردار شفیق طوسی کو ملاحظہ کیجیے جو ممتاز گائک ہے۔ بذلہ سنج ہے، سماج میں عزت تو ہے لیکن بقول منٹو، کم لوگ جانتے ہیں کہ تین سگی بہنوں کو یکے بعد دیگرے تین تین چار چار سال کے وقفے کے بعد داشتہ بنانے سے قبل ان کا تعلق ان کی ماں سے بھی تھا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ اس کی پہلی بیوی تھوڑے عرصہ میں مرگئی تھی اس لیے پسند نہیں تھی کہ اس میں طوائفوں

جیسے عشوے غمزے نہیں تھے۔ یہی طوسی صاحب اپنی ماہر الکلامی اور خوش گفتاری کی وجہ سے زینت کے قریب آنے لگتے ہیں جس کو سینڈو کی بیگم یوں تاڑتی ہے جیسے خلیفے اکھاڑے کے باہر بیٹھ کر اپنے پٹھوں کے پیچ دیکھتے ہیں۔ گوپی ناتھ چاہتا ہے کہ زینت کی شادی طوسی سے ہو جائے لیکن طوسی یہ کہہ کر انکار کرتا ہے:

''زینت بہت اچھی عورت ہے لیکن افسوس ہے کہ بے حد شریف ہے۔ ایسی عورتوں سے جو بیویوں جیسی لگیں، مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔''

بالآخر حیدر آباد کے ایک دولت مند زمیندار غلام حسین سے زینت کی شادی ہو جاتی ہے اور کہانی ایک عجیب کلائمکس کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے جو منٹو کا خاصہ ہے۔ اختتام ایک نامعلوم اور دلخراش حقیقت کے ساتھ آتا ہے۔ وہ منٹو جو اس کہانی میں ادیب ہے، صحافی ہے، شریف انسان ہے ایک دم زیر ہو جاتا ہے اور وہ گوپی ناتھ جو اوباش اور نادان ہے انسانیت کا سبق سیکھتا ہے اور منٹو کو بھی سکھاتا ہے اور افسوس کے ساتھ کہتا ہے:

''منٹو صاحب میں سمجھتا تھا کہ آپ بڑے سمجھدار اور لائق آدمی ہیں۔ زینو کا مذاق اُڑانے سے پہلے آپ نے کچھ سوچ لیا ہوتا۔''

بابو گوپی ناتھ کے لہجے میں وہ عقیدت جو اسے مجھ سے تھی زخمی نظر آئی لیکن پیشتر اس کے کہ میں اس سے معافی مانگوں اس نے زینت کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بڑے خلوص کے ساتھ کہا۔

''خدا تمہیں خوش رکھے۔''

یہ کہہ کر بابو گوپی ناتھ نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ان میں ملامت تھی، دُکھ بھری ملامت۔ اور چلا گیا۔''

عیاش و اوباش بابو گوپی ناتھ چلا نہیں جاتا بلکہ اپنی پوری انسانیت کے ساتھ قاری کے ذہن پر مسلط ہو جاتا ہے صرف اپنے کردار کی بوالعجبی کی وجہ سے اور سماج کی آڑی ترچھی اور پوشیدہ حقیقت کی وجہ سے بھی، اس درس کی وجہ سے بھی جو اس نے اپنی تمام تر جہالت و

کمینگی کے باوجود ذی علم اور شریف منٹو کو دیا۔ وارث علوی نے اچھی بات لکھی ہے:

''ظاہری اخلاقیات سے ماورا ایک چیز ہے جو گوہر گراں مایہ ہے اور وہ ہے انسانیت اور معصومیت۔.......... منٹو کیسے جان سکتا تھا اگر گوپی ناتھ اسے یہ نہ بتاتا گویا کردار خود ذریعہ ہوتے ہیں فنکار کو عرفانِ حیات بخشنے کا.........اچھا ہوا کہ گوپی ناتھ نے افسانہ کی دنیا میں جنم لیا ورنہ ہم بھی یہ عرفان حاصل کیے بغیر دنیا سے رخصت ہو جاتے۔''

وارث یہ بھی کہتے ہیں:

''بڑے فنکار کی یہی خوبی ہے کہ وہ جہنم کا بیان باہر سے نہیں اندر سے کرتا ہے۔'' اور اس میں وہ خود بھی جلتا ہے اور جھلستا ہے۔

ممتاز شیریں اس افسانے سے منٹو کی افسانہ نگاری کا دوسرا دور شروع کرتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس سے قبل منٹو محض تماشائی تھا لیکن یہاں سے وہ برائی، نیکی، و بدی میں اپنے آپ کو برابر سے شریک کرتا ہے اور دوسرے کرداروں کی طرح اپنے آپ کو ذلیل و رسوا بھی کرتا ہے۔ حقیقت شناسی کی یہ جرأت اردو افسانے میں کم دیکھنے کو ملتی ہے۔

وہ منٹو جو اس افسانے میں نیک و شریف ہے اور حالات و کردار کا خاموش تماشائی ہے اسی منٹو پر الزام لگنے لگتے ہیں۔ منٹو بدنام افسانہ نگار ہے، منٹو فحش نگار ہے۔

منٹو کے دماغ میں خلل ہے۔ وہ ضدّی ہے، بد دماغ ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن منٹو خود کیا کہتا ہے اسے بھی ملاحظہ کیجیے:

''زمانے کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اگر آپ اس سے واقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیے۔ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زمانہ ناقابلِ برداشت ہے۔ مجھ میں جو برائیاں ہیں وہ اس عہد کی برائیاں ہیں۔ میری تحریر میں کوئی نقص نہیں، جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے دراصل وہ موجودہ نظام کا نقص ہے۔''

سماجی نظام کے نقائص پر تو بیشتر ترقی پسند افسانہ نگاروں نے افسانے لکھے اور

خوب خوب لکھے، لیکن منٹو سب سے الگ ہے۔ یہ الگاؤ کیا ہے؟ یہ علاحدگی کس قسم کی ہے۔ یہ وہ سوال ہے۔ یہ وہ نازک امتیاز ہے جو ہر ایک کے قابو میں نہیں آتا۔ اگر منٹو محض نظام کے اُلٹ پھیر، بے ترتیبی، ناہمواری پر افسانے لکھتا تو شاید وہ کورا ترقی پسند افسانہ نگار ہوتا، اگر چہ سچ یہ ہے کہ ترقی پسندی کسی بندھے ٹکے مفہوم کا نام نہیں اس لیے منٹو اپنے آپ کو ترقی پسند کہتا ہے لیکن ہنگامہ پسند نہیں۔ ایک زمانہ میں وہ اشتراکی بھی تھا لیکن حالات کے زیر و بم اور کیف و کم کے ساتھ اس کے اشتراکی خیالات نے شکلیں بدل لیں۔ اس نے معاشرہ کے اندر پیوست ان انسانی حقیقتوں اور ذہنی رویّوں کو سمجھنے، گرہیں اور گتھیوں کو الجھنے و سلجھنے کے طور طریقے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جہاں دیگر لوگوں کی نظریں آسانی سے پہنچ نہیں پاتیں۔ معاشرہ کی ناہمواریاں اور انسانی جبلّت کے پیچ و خم جب باہم مُدغم ہوتے ہیں تو ایک نئی حقیقت جنم لیتی ہے اور اس کے بطن سے رنگا رنگ، برہنہ اور بے رحم حقیقتیں منہ پھیلانے لگتی ہیں۔ منٹو کی باریک اور دوربیں نگاہ ایسی ہی پیچیدہ اور بظاہر نہ دکھائی دینے والی حقیقتوں پر جاتی ہے اور منٹو اسے پورے فنکارانہ اور سفّاکانہ انداز میں پیش کر دیتا ہے۔

حقیقت کی راست بیانی ایک مستحسن عمل تو ہے لیکن اس سے زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ پیچیدہ و ژولیدہ حقیقتوں کو اسی بیان، فکر و فن کے ساتھ پیش کیا جائے جیسا کہ منٹو کرتا ہے ظاہر ہے کہ یہ کوئی معمولی عمل نہیں۔ گمبھیر بات کو گمبھیر طریقہ سے کہنا ایک گمبھیر عمل ضرور ہے لیکن اس فنّی حقیقت کا کیا کیا جائے کہ عمدہ اور بڑا فن سنجیدگی سے پیچیدگی کی طرف نہیں جاتا بلکہ پیچیدگی سے سنجیدگی کی طرف اور سلاست کی طرف جاتا ہے کہ عمدہ اور بڑا ادب ہمیشہ مشکل سے آسانی کی طرف جاتا ہے۔ منٹو کے حوالے سے اس اہم و نازک امر کو آج کے نام نہاد علامتی و تجریدی افسانہ نگاروں کو سمجھنا چاہیے اور ان لوگوں کو بھی جو اچھی خاصی تخلیق کو غیر ضروری فکر و فلسفہ سے بوجھل کر کے اسے فن سے دور کر دیتے ہیں۔

آج سے کافی عرصہ قبل ممتاز ناقد عبادت بریلوی نے منٹو کی حقیقت نگاری پر ایک طویل مضمون لکھا تھا جس میں انہوں نے منٹو کی حقیقت نگاری کو جدید مفہوم سے غیر ہم

آہنگ قرار دیا تھا لیکن ساتھ میں یہ بھی کہا کہ یہ جانتے ہوئے کہ حقیقت نگاری کا تصور جدید نظریات سے ہم آہنگ نہیں ہے. جی چاہتا ہے کہ اس کو حقیقت نگاری سے تعبیر کیا جائے۔ اسی طویل مضمون میں وہ لکھتے ہیں:

''انسان اور انسانیت کی آواز جگہ جگہ اس کے یہاں سنائی دیتی ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ اس زندگی کے سماجی پہلو سے گہرا شعور نہ رکھتا تھا۔''

یہ غلط فہمی غالباً منٹو کے اس بیان سے ہوتی ہے جس میں وہ صاف کہتا ہے:

''میں تہذیب و تمدّن کی اور سوسائٹی کی چولی کیا اُتاروں گا جو ہے ہی ننگی، میں اسے کپڑے پہنانے کی کوشش بھی نہیں کرتا اس لیے کہ یہ کام میرا نہیں ہے۔ یہ کام درزیوں کا ہے۔''

منٹو کی ضدّی وانا گیر طبیعت کے ذریعے ایسے تلخ و شیریں بیانات نے خاصی غلط فہمی پھیلائی ہے اور اکثر نقادوں کے قلم سے وہ معتوب بھی ہوا ہے۔ عبادت بریلوی جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''اس حقیقت کا وجود اپنی جگہ باقی کہ سوسائٹی ننگی ہے۔ تہذیب و تمدّن برہنہ ہے اس کو کپڑے پہنانے کا کام بھی اپنے ذمہ لینا چاہئے۔ اس کام کو درزیوں کے سپرد کر دینا کوئی اچھی بات نہیں۔''

اس کے باوجود منٹو کی حقیقت نگاری پر لکھتے ہوئے عبادت بریلوی نے رومانیت اور ماورائیت پر بحث اٹھا کر خود حقیقت شناسی کے اس نئے روپ کا جواز پیش کر دیا۔ باقی بہت ساری باتوں کا جواب وارث علوی نے اپنی کتاب ''منٹو ایک مطالعہ'' میں دیا ہے اس لیے میں یہاں کوئی پرانی بحث نہیں چھیڑنا چاہتا، صرف وارث علوی کے یہ جملے دہرانا چاہتا ہوں:

''منٹو کی بے لاگ اور سفاک حقیقت نگاری نے بے شمار عقائد، مسلّمات اور تصورات کو توڑا ہے اور ہمیں شعلۂ حیات کو برہنہ انگلیوں سے چھونے کی جرأت عطا کی۔ منٹو

کے ذریعے ہم پہلی بار ان حقائق سے آشنا ہوئے جن کا صحیح علم نہ ہوتو آدمی نرم و نازک اور آرام دہ عقائد کی محفوظ تحویل میں چھوٹی موٹی شخصیتوں کی طرح جیتا ہے۔''

الغرض عرض مدّعا یہ ہے کہ ایک حقیقت وہ ہوتی ہے جو آدرش اور رومان کے درمیان سے پھوٹتی ہے، ایک حقیقت وہ ہوتی ہے جو اصول ونظریات سے پرے معاشرے کے اندرون میں پیوست ہوتی ہے، جو عموماً پہلی نظر میں دکھائی نہیں دیتی۔ ایک خیال یہ ہے کہ منطق اور لاجک کے بغیر حقیقت کا کوئی وجود نہیں ہوتا لیکن ایک خیال یہ بھی ہے کہ سچّی حقیقت یا برہنہ حقیقت ان دونوں سے ٹکراتی ہے اور اکثر مخالف رویہ اپنا کر الگ راہ اختیار کرتی ہے۔ شاید یہی وہ نازک موڑ ہے جہاں منٹو ترقی پسند افسانہ نگاروں سے الگ ہو جاتا ہے۔ جو لوگ سکّہ بند سماجی حقیقتوں اور اخلاقی رویّوں سے اپنے آپ کو الگ نہیں کر پاتے اکثر وہ اس بات کو سمجھ نہیں پاتے کہ زندگی اتنی حسین نہیں ہے جیسی کہ آدرشوادی اپنے تخیّل میں سجاتے ہیں۔ حالانکہ اتنی بھیانک اور مایوس کُن بھی نہیں جتنی بعض قنوطی اور افسردہ دل قرار دیتے ہیں۔ حقیقت تو بقول ایچ فاسٹ:

''سچّی حقیقت تو ان دونوں کے درمیان ایک کڑی ہوتی ہے۔ خلاّقانہ و فنکارانہ حقیقت ایک وہ ادبی کرشمہ ہے جو انتخاب اور تخلیق کے حوالوں سے اپنے اصل روپ کو قارئین کے سامنے پیش کرتی ہے۔''

شاید یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ تخلیق کی سطح پر حقیقت کو کورا آدرش یا کورے آدرش کو ہی حقیقت ماننے میں تکلیف محسوس کرتے ہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ حقیقتوں کے انیک روپ ہوتے ہیں وہ ثابت ہوتی ہے اور سیّال بھی۔ وہ ساکت ہوتی ہے اور فعّال بھی۔ کس وقت کون سی حقیقت اور کون سی شئے اہم ہے اور کون سی غیر اہم، یہ طے کر پانا بھی مشکل کام ہوتا ہے۔ بابو گوپی ناتھ ہوں، ممّد بھائی یا ایشر سنگھ یا منگو کوچوان۔ ان برے و معمولی آدمیوں میں اچانک نیکی کا فرشتہ جاگ اُٹھتا ہے اور سفید پوشوں کا باطن سیاہ ہو جاتا ہے۔ شریف انسان میں شرافت اور ذلیل انسانوں میں ذلالت تو سبھی دیکھتے ہیں لیکن

بُرے سے بُرے انسانوں میں انسانیت اور اچھے سے اچھے انسان میں خباثت کو دیکھ پانا اور دکھا پانا ایک ایسی پیچیدہ حقیقت کی تلاش ہے جو کسی بھی طرح آسان نہیں۔ یہ وہ فعلِ محال ہے جو تلوار کی دھار پر چلنے کی مترادف۔ کردار مرد کے ہوں یا عورت کے منٹو کے یہاں ایسے برے بکھرے اور پامال کرداروں کی بھیڑ ہے لیکن اس میں چونکا دینے والی بلکہ رونگٹے کھڑی کردینے والی حقیقتوں کی نئی دنیا، گتھیاں، انسانی نفسیات کی پیچیدہ تر الجھنیں واذیتیں جذب و پیوست ہیں۔ منٹو کی یہی حیات ہے، یہی کائنات اور یہی جمالیات بھی۔ منٹو کے جنس، جذبات اور فسادات سے متعلق افسانوں کو اس سے الگ کر کے دیکھ پانا مشکل ہے۔

ایک سچ یہ بھی ہے کہ منٹو کی تلاشِ حقیقت میں ایک بغاوت تھی۔ ضد اور تلخی بھی۔ کچھ اس کے ذاتی حالات نے بھی اسے تلخ بنا دیا تھا۔ کچھ یہ بھی کہ بیسویں صدی کی چوتھی پانچویں دہائی تک پہنچتے پہنچتے کلاسکیت اور رومانیت کے خلاف واقعیت نگاری اور معاشرتی حقیقت نگاری کا ایک نیا رجحان شروع ہو چکا تھا۔ ''انگارے'' کے افسانے اور بعض دیگر ترقی پسند و حقیقت پسند افسانے اس کا بگل بجا چکے تھے۔

یہ الگ بات ہے کہ نئی حقیقت نگاری کے اس رجحان میں منٹو ذاتی ومعاشرتی اسباب، عوامل ومحرّکات کی بنا پر ان سب سے الگ تھا اور شاید سب سے جارح اور سفاک بھی جہاں فرد اور معاشرہ دونوں کی تلخیاں وکمزوریاں ایک ہو جائیں، ضد اور جرأت، فکر وفن کا ناگزیر حصہ بن جائیں وہاں فنکار کا بھی، فرد ومعاشرہ کے تئیں عمیق مطالعہ ومشاہدہ افراد و اشیا سے قریب ترین رشتہ استوار کر لیتا ہے کیونکہ اگر ایسا نہ کرے تو افسانہ نگار اپنے ذہن اور افسانہ اپنے مرکز سے بکھر جائے اس لیے کہ افسانہ کی شکل یا فن منمانے ڈھنگ سے ارتقا نہیں پاتے بلکہ نفسِ افسانہ سے جذباتی ونظریاتی طور پر گہری وابستگی کے ذریعہ نمو پذیر ہوتے ہیں۔

کسی فن کی قدر شناسی میں سماج اور سیاست کا بالواسطہ یا بلاواسطہ دخل تو ہوتا ہی ہے لیکن اس سے زیادہ اس کا دارومدار اس حقیقت پر ہوتا ہے جسے فنکار نے دونوں حوالوں

سے اپنے باطن میں جذب و پیوست کیا ہو اور فکر وفن کا حصہ بنا دیا ہو۔ اگر کوئی فنکار صحیح معنوں میں ترقی پسند اور حقیقت پسند ہے اور اس کا تعلق نچلے طبقہ اور اس کے کرداروں سے مخلصانہ و ہمدردانہ ہے تو اس حقیقت کو سمجھنے اور سمجھانے کے بے شمار راستے کھل جاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض راہیں راہِ راست کی مصداق ہوتی ہیں اور بعض پر گمراہی کا الزام لگ جاتا ہے لیکن یہ دونوں حقیقتیں ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہوتی ہیں۔

اب یہ سوال اُٹھتا ہے کہ حقیقتوں کے اس نازک فرق کو کس قدر اور کس طرح گرفت میں لیا جائے۔ حقیقت کا سچّا اور تیکھا عرفان کس طرح حاصل کیا جائے؟ یہ بحث طلب مسئلہ ہے اور غور طلب بھی۔ منٹو سے متعلق وقار عظیم، حسن عسکری، ممتاز شیریں سے لے کر وارث علوی تک نے بڑی ژرف نگاہی کے ساتھ منٹو کی حقیقت نگاری کو سمجھنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ سوال ہنوز برقرار ہے کہ کیا مکمل منٹو سمجھ میں آ گئے یا منٹو کی تمام حقیقتیں تہہ در تہہ آشکار ہو گئیں۔

جس دن مکمل منٹو سمجھ میں آ گئے اسی دن منٹو کی موت ہو جائے گی البتہ یہ ضرور ہے کہ جیسے جیسے سماج کی ناہمواریاں، کمینگی، حرام زدگی فزوں تر ہوتی جائے گی اور معاشرہ کے درون کا پیچیدہ و غلیظ حصہ بنتی جائے گی منٹو کی تہہ دار معنویت اور حقیقت کے در وا ہوتے جائیں گے اور نت نئی حقیقتوں کے پردے سرکتے جائیں گے۔ بڑے فن اور فنکار کی یہی اصل پہچان ہوتی ہے کہ ہر دور میں اس کی معنویت نت نئے انداز اور انوکھے زاویہ سے ہوتی ہے اور وہ ہر عہد کا ساتھ نبھاتا رہتا ہے۔ منٹو کی عظمت کا راز یہی ہے۔

چلتے چلتے ایک سوال اور۔ کیا وجہ ہے کہ آج کے افسانوں میں انسان دوستی، حقیقت نگاری کا یہ رنگ نظر نہیں آتا اور وہ کردار بھی نظر نہیں آتے جو صرف منٹو کے ہی نہیں پورے افسانوی ادب کے لازوال کردار ہیں۔ یہ اعتراف کہ آج کے نئے نئے علوم وفنون، انکشافات اور تجربات نے نئے نئے روپ لے لیے ہیں۔ دنیا علم وخبر کا منبع بن کر رہ گئی ہے۔ حقیقت نگاری کا قدیمی وکلاسیکی تصور بھی نہیں رہا جو منٹو اور اس کے ہم عصروں کے درمیان تھا

لیکن کیا صرف یہی وجہ ہے کہ آج کے افسانوں میں منگو کوچوان، ممد بھائی، بابو گوپی ناتھ، کالو بھنگی، گھیسو مادھو جیسے مرد کرداراور دھنیا، لاجونتی، سوگندھی، موذیل، آپا، اندو، رضو باجی جیسے عورتوں کے کردار دور دور تک نظر نہیں آتے۔ اردو افسانے سے یہ سارے کردار کہاں رُوٹھ گئے۔ کیا اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے؟ اور اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ محض لفاظی کرنے، چلتے پھرتے کردار پیش کرنے یا لمحاتی سچویشن پیش کرنے سے اچھے افسانے اور پُر اثر کردار جنم نہیں لیتے۔

اردو افسانے میں حقیقت نگاری کا ارتقا کیسے ہو اور جذبات نگاری اور کردار نگاری کی توسیع کس طرح ہو، مجموعی طور پر آج کے تخلیقی ادب میں عوامی وانسانی حقیقت کے فن کا دائرہ کیسے وسیع ہو۔ ان سوالات پر ہم سبھی منٹو کے عقیدت مندوں اور وارثوں کو سوچنا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس سوال کا جواب بھی تمام حقیقت، عام زندگی اور عام جد و جہد کو سمجھنے اور اس میں شامل ہوئے بغیر نہیں مل سکتا۔ سماجی حقیقتوں، انسانی واخلاقی بصیرتوں کی آگ میں جلے اور پگھلے بغیر نہیں مل سکتا جیسا کہ خود منٹو جلا اور پگھلا اور سقراط کی طرح زندگی کا زہر پی گیا۔ تبھی تو ممتاز شیریں لکھتی ہیں:

''معاشرہ کی بدی، بدصورتی اور گندگی کو اس نے بہت قریب سے دیکھا اور زندگی کے زہراب کو اس طرح چکھا کہ اس کی تلخی کام و دہن سے گزر کر رگ و پے میں اتر گئی۔ زندگی کے مشاہدے اور تجربے میں منٹو نے اپنے آپ کو موم شمع کی طرح پگھلایا اور زندگی کے ایسے پہلوؤں کو پوری جرأت و بیبا کی اور بے رحم صداقت کے ساتھ پیش کیا جنھیں چھونے کی ہمارے یہاں بہت کم ادیبوں کو جرأت ہو سکی۔''

نور شاہ

منٹو اور فلم

اُردو ہندوستانی زبانوں میں ایک اہم زندہ جاوید دلکش و شیریں زبان ہے۔ یہ خیر سگالی اتحاد پسندی، رواداری اور انسانیت سے عبارت ہے۔ اُردو دلوں کی زبان ہے۔ دلوں کو جوڑنے کی زبان ہے اور اس بات سے بھی انکار کی گنجائش نہیں کہ اردو زبان کی اپنی ایک جاذبیت اور افادیت ہے۔ اس کی ثقافتی، تہذیبی اور تمدنی تاریخ میں ہماری اکثر فلموں کی کامیابی کا راز پوشیدہ ہے۔

یہ آج کی بات نہیں بلکہ یہ سلسلہ تب ہی سے شروع ہوا جب فلم نے سنیما کی آغوش میں اپنی آنکھ کھولی۔ آنکھ کھلتے ہی سنیما کے شائقین کے کانوں میں جو مکالمے سنائی دیئے وہ اُردو زبان کی جمالیاتی کیفیات سے سجے سنورے تھے اور اس وجہ سے شروع سے ہی فلم میں اردو زبان کے سنجیدہ، شائستہ اور شیریں لہجے کو مقبولیت حاصل ہوتی رہی۔

سعادت حسن منٹو کے تخلیقی کارناموں سے کون واقف نہیں، وہ اپنے دور کے عظیم اور بلند قامت افسانہ نگار تھے اور آج بھی ان کی بے لاگ اور بے باک نثر نگاری زندگی کی کتاب کے مختلف اوراق کی عکاسی کرتی ہے۔

ان کے تحریر کردہ افسانوں کی عظمت آج بھی قائم و دائم ہے۔ ان کی مختصر سی زندگی کا بیشتر حصہ مشاہدات سے زیادہ تجربات میں گزرا۔ اُن کی ممبئی کی زندگی نہایت صبر آزما دور سے دو چار ہوئی۔

کہا جاتا ہے کہ فلمی دنیا میں اُن کی شمولیت ایک مجبوری تھی۔ روٹی روزی کی

مجبوری ، حصول معاش کی مجبوری، لاہور کی غیر صحت مند صحافتی زندگی سے فرار کی مجبوری۔

ممبئی آ کر منٹو نے اُس دور کے معروف اور نامور فلمی جرائد مصور اور فلم انڈیا میں بحیثیت کالم نویس شمولیت اختیار کی۔ حالانکہ اس وقت وہ بحیثیت افسانہ نگار ایک بلند مقام حاصل کر چکے تھے اور اُن کے کئی افسانے مقبول ہو چکے تھے۔ ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ' آتش پارے' کے عنوان سے ۱۹۳۵ء میں شائع بھی ہو چکا تھا جبکہ اُن کی عمر صرف بائیس برس کی تھی۔ بعد میں انہوں نے فلمی رسالہ مصور کی ادارت بھی سنبھالی۔

نذیر چودھری رسالہ مصور کے مالک تھے، وہ منٹو کے چاہنے والوں میں سے تھے۔ تنخواہ چالیس روپیہ ماہانہ مقرر ہوئی۔ نذیر چودھری کی بدولت منٹو بابوراؤ پٹیل کے قریب آئے جن کے کہنے پر منٹو نے پربھات پکچرز کے لیے فلم کے خلاصے کا اردو میں ترجمہ کیا جو بے حد پسند کیا گیا اور وہ فلمی منشی کہلانے لگے۔

انہیں مکالمہ نویسی کا کام سونپا گیا۔ تنخواہ چالیس روپے مقرر ہوئی لیکن یہ نئی ملازمت ملتے ہی رسالہ مصور کے مالک نے منٹو کی تنخواہ کم کر کے بیس روپیہ ماہانہ مقرر کی۔ ۱۹۳۷ء میں منٹو نے امپیریل فلم کمپنی میں بطور اسکرِپٹ رائٹر ملازمت اختیار کی۔ اب وہ فلمی کہانیوں کی تکنیک سے واقف ہو چکے تھے، تنخواہ ماہانہ ساٹھ روپے مقرر ہوئی۔ منٹو نے خود ہی ایک فلمی کہانی لکھی تھی لیکن فلم کمپنی کے مالک اس شرط پر کہانی لینے پر راضی ہو گئے کہ منشی کے بدلے کسی اور نامور شخص کا نام بطور اسکرپٹ رائٹر دیا جائے۔ اس کے لیے پروفیسر ضیاء الدین کے نام کا انتخاب ہوا لیکن فلم ناکام ہوئی اور کمپنی کو کافی نقصان اُٹھانا پڑا۔

کچھ عرصہ بعد منٹو کو ایک دوسری فلم کمپنی فلم سٹی میں ملازمت ملی، اس کمپنی کے

مالک اپنے زمانے کے معروف ہدایت کار اور اداکار تھے۔ تنخواہ سو روپے مقرر ہوئی۔

جب امپیریل کمپنی والوں کو اس بات کی اطلاع ملی کہ ان کا منشی کہیں اور کام کرنے لگا ہے تو منٹو کو فلم سٹی کی ملازمت سے سبکدوش کروایا گیا۔ امپیریل فلم کمپنی میں منٹو ایک سال تو رہے لیکن تنخواہ صرف آٹھ ماہ کی ملی۔ یہ فلم کمپنی ان دنوں منٹو کی تحریر کردہ کہانی پر فلم 'کشن کنہیا' بنا رہی تھی۔ اسی دوران ایک گجراتی سیٹھ نانو بائی دیسائی نے اپنی ایک فلم کمپنی 'ہندوستان سنے ٹون' کے نام سے قائم کی۔

منٹو یہاں آ گئے، تنخواہ سو روپیہ ماہانہ مقرر ہوئی۔ یہاں منٹو کو اپنی مرضی سے کہانی لکھنے کی آزادی دی گئی۔ فلم کا نام رکھا گیا MUD یعنی کیچڑ۔ منٹو کو یقین تھا کہ اس فلم کی کہانی کے ذریعے وہ ہندوستانی عوام کی بہتر طور سے نمائندگی کر سکیں گے لیکن بعد میں اس فلم کا نام بدل کر 'اپنی نگریا' رکھ دیا گیا۔

فلم جب ۱۹۴۰ء میں نمائش کے لیے پیش کر دی گئی تو ایک عجیب سی بات دیکھنے کو ملی۔ فلم میں منٹو کا نام بطور کہانی کار دِکھایا گیا لیکن مکالمہ نویس کی حیثیت سے کسی اور کا نام پیش کیا گیا۔

اب شاید منٹو نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ جو شخص اپنی تحریر کا ایک لفظ بھی بدلنے کو تیار نہ ہوتا تھا، اس نے فلم میں اپنے نام کی جگہ کسی دوسرے کا نام دیکھ کر خاموشی اختیار کی۔ لیکن وہ ضرور اس فلمی ماحول سے مایوس ہو گئے۔ فلم کامیاب رہی لیکن وہ فلمی دنیا چھوڑ کر دلی آ گئے اور آل اِنڈیا ریڈیو میں ملازمت اختیار کی۔ یہاں قریب دو سال رہے اور پھر دوبارہ ممبئی لوٹ آئے۔ وہ دوبارہ فلمی میگزین مصور کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ اسی دوران لاہور سے اُن کے پُرانے دوست فلم ساز شوکت حسین رضوی ممبئی آ چکے تھے اور اُنہیں دنوں وی ایم ویاس نے سن رائز پکچرز کے نام سے نئی فلم

کمپنی کی بنیاد ڈالی تھی۔

ویاس نے شوکت حسین رضوی اور نور جہاں کو اپنی نئی فلم کے لیے منتخب کیا۔ سعادت حسن منٹو کو کہانی لکھنے کے لیے کہا گیا۔ منٹو نے 'نوکر' کے نام سے کہانی لکھی۔ ہدایت شوکت حسین رضوی کے سپرد ہوگئی۔ رفیق غزنوی نے موسیقی مرتب کی اور نور جہاں کو فلم کا مرکزی رول ادا کرنے کے لیے لیا گیا۔

جب منٹو کو احساس ہوا کہ نور جہاں اور شوکت حسین ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں تو منٹو نے دونوں کو قریب لانے میں مدد کی۔ ان کی شادی ہوئی لیکن منٹو حیران تھے کہ آخر رضوی صاحب نور جہاں پر اس قدر دیوانہ کیوں تھے جبکہ بقول ان کے نور جہاں میں کوئی کشش نہ تھی۔ سوائے مدہوش کن اور سحر انگیز آواز کے۔

پھر سعادت حسن منٹو ہدایت کار شاہد لطیف کے قریب آئے اور ان کی ٹیم میں شامل ہو گئے۔ اس ٹیم میں عصمت چغتائی، اوپندر ناتھ اشک اور راجہ مہدی علی خان سرِ فہرست تھے۔ تنخواہ تین سو روپیہ ماہانہ مقرر ہوئی۔ اس طرح فلم' چل چل رے نوجوان' کا اِسکرِپٹ تیار ہوا۔ مرکزی رول پری چہرہ نسیم نے ادا کیا لیکن فلم اُمید کے مطابق کامیاب نہ ہوسکی۔ پھر نسیم بانو کی خوبصورتی اور اس کے حُسن و جمال کو اچھی طرح سے ابھارنے کے لیے' بیگم' نام سے ایک کہانی لکھنے کی ذمہ داری منٹو پر ڈالی گئی۔

لیکن جب فلم ریلیز ہوئی تو منٹو کی تحریر کردہ کہانی کا بہت کم استعمال کیا گیا تھا۔ لیکن اب منٹو کو کمپنی پانچ سو روپیہ ماہانہ تنخواہ دیتی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ ایک رات منٹو کو اپنی بیگم کے ہمراہ نسیم بانو کے گھر میں ایک رات گزارنے کا موقع ملا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ نسیم بانو کے گھر میں کوئی نوکر نہ تھا۔ وہ گھر کے سارے کام خود ہی انجام دیتی تھیں۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ نسیم بانو

نے سونے سے پہلے اپنا سارا میک اَپ اُتارا، وضو کیا اور تلاوت قرآن میں مصروف ہوگئیں۔

فلم ساز گیان مکھر جی 'شکاری' نام سے ایک فلم بنا رہے تھے۔ کہانی میں کوئی جان نہ تھی، اس لیے یہ کام منٹو کے سپرد کیا گیا۔ انہوں نے کہانی کا نقشہ ہی بدل ڈالا۔ فلم کی ہیروئن پارو تھی۔

کہتے ہیں کہ ایک محفل میں پارو نے بازاری قسم کے گانے گائے، پھر یہ جان کر کہ منٹو مسلمان ہے، ایک نعت شروع کردی۔ منٹو نے فوراً ہی روک لیا اور کہا، پارو دیوی یہ محفلِ نشاط ہے، مئے ناب بہہ رہی ہے، اس غلاظت بھرے ماحول میں کملی والے کا ذکر نہ کیجئے!

منٹو نے فلمی اداکاروں پر اپنے قلم کے تیر چلائے۔ ان کی زندگی کے پوشیدہ گوشوں کو بے نقاب کیا۔ انہوں نے اپنے قلم کی سیاہی سے ان فلمی اداکاروں کی زندگی کے بدصورت پہلوؤں کو عوام کے سامنے پیش کیا۔

انہوں نے فلمی دنیا کی باریکیوں میں جھانک کر دیکھا۔ یہاں انہوں نے جو کچھ بھی دیکھا اسے قلم بند کیا۔ منٹو کے حصے میں چند فلمیں آئیں، ان کی تحریر کردہ فلموں کے نام ہیں، کشن کنہیا، اپنی نگریا، چل چل رے نوجوان، گھر کی شوبھا، بیگم، شکاری، جھمکے، گھمنڈ اور آٹھ دن۔

آٹھ دن کی کہانی منٹو نے مکھر جی کے کہنے سے لکھی۔ انہوں نے ایک نئے انداز کی کہانی لکھی۔ اس فلم میں چار نئے چہرے شامل کئے گئے۔ راجہ مہدی علی خان، اوپندر ناتھ اشک، محسن عبداللہ اور سعادت حسن منٹو۔ منٹو نے فلم میں پاگل فلائٹ لیفٹننٹ کا رول ادا کیا اور اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔

سعادت حسن منٹو نے کبھی بھی اپنی تحریر کردہ فلمی کہانی پر فخر محسوس نہیں کیا کیوں کہ ان کے تحریر کردہ اسکرِ پٹ کو کبھی بھی اُن کے تحریر کردہ انداز میں پیش نہیں کیا گیا۔

منٹو غالب کے پرستاروں میں سے تھے۔ ۱۹۴۰ء کے دوران جب وہ ممبئی میں تھے تو انھوں نے غالب کی زندگی کے تعلق سے مواد اِکٹھا کرنا شروع کیا اور ایک کہانی کو ترتیب دیا۔ تقسیم ملک کے وقت منٹو پاکستان چلے گئے لیکن ان کی تحریر کردہ کہانی کو راجندر سنگھ بیدی نے مکمل کیا۔ مکالمے بھی لکھے اور سہراب مودی نے اس کو فلمایا۔

پاکستان میں سعادت حسن منٹو نے بیلی اور دوسری کوٹھی کے نام سے دو فلمی کہانیاں قلم بند کیں۔ ہندوستان میں منٹو کی وفات کے برسوں بعد ان کی مشہور کہانی 'کالی شلوار' پر ایک فلم بنائی گئی۔ اس میں عرفان خان اور سعدیہ نے مرکزی کردار ادا کئے۔ اس کے علاوہ فلم ہدایت کار کلدیپ نے بھی ممبئی اور منٹو کے نام سے ایک دستاویزی فلم بنائی۔

ریاست جموں وکشمیر کے عوام کو اس بات کا فخر ہے کہ اس عظیم اور بلند قامت افسانہ نگار کا تعلق کشمیر سے تھا۔ ان کے آباواجداد کشمیری تھے!!

محمد ایوب واقف

سعادت حسن منٹو کی ضدی فطرت

عام طور پر جب کوئی برگزیدہ، ممتاز اور قد آور فنکار کم عمری میں عدم کی راہ لیتا ہے تو ہم فی الفور کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ قدرت نے یہ کیا ستم کیا کہ انہیں اٹھالیا، کاش انہیں کچھ اور موقع ملتا، تا کہ وہ اپنی شناخت کو پائنداری اور استحکام عطا کرنے کی غرض سے کچھ دوسری مرتفع اور معتبر تخلیقات پیش کر سکتے جنہیں ہم ان کے دوسرے فن پاروں کے ساتھ مدت مدید تک اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتے۔ ہم اس طرح کے بیانات کو لوگوں کے ذہنی فتور کے ہم مشابہ سمجھتے ہیں، یہاں ہم ترقی پسند تحریک کے دو انتہائی، ذہین جیالے، پسندیدہ اور معتبر تخلیق کاروں کو مثال کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں۔

ایک کو دنیائے ادب اسرار الحق مجاز کے نام سے جانتی ہے اور دوسرے کو سعادت حسن منٹو کے نام نامی اور اسم گرامی کی حیثیت سے جانتی ہے۔ دونوں کے انتقال پر اس طرح کے اضعف بیانات صادر کیے گئے۔ دراصل جب ہم ایسی لغو اور فرسودہ باتوں کو زبان پر لاتے ہیں تو ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ قدرت کا ایک اٹل قانون ہوتا ہے۔ جس کے تحت موت و حیات کا فیصلہ صادر ہوتا ہے۔ یہ قدرتی فیصلہ کسی طرح نا بکار نہیں ہوتا اور نہ ہی رحلت پانے والے کے ساتھ کسی ناانصافی کا مرتکب ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ قدرت کی مصلحت ہماری آپ کی سمجھ سے باہر ہے۔

اس فانی اور ناپائدار دنیا میں دیکھا یہ گیا ہے کہ قدرت جس سے جتنا کام لینا چاہتی ہے اسے ایک متعینہ وقت میں بے کم و کاست لے لیتی ہے اسے اس کے لیے کوئی طویل اور بسیط عمر درکار نہیں ہوتی۔ مجاز کا انتقال کم عمری میں ہوا لیکن انہوں نے اپنی تمام تر کم عمری کے باوجود ''آہنگ'' جیسا بھاری بھرکم مجموعۂ کلام دیا جس میں ان کی جلیل القدر اور فنی

محاسن سے آراستہ و پیراستہ نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ جن شعرا کا انتقال ایک طویل مسافت طے کر لینے کے بعد ہوتا ہے انہوں نے اپنے مستند کلام کا اتنا بڑا ذخیرہ اپنی یادگار کے طور پر نہیں چھوڑا۔ نتیجتاً قاضی عبد الغفار کو مجاؔز کے انتقال پر کہنا پڑا کہ اردو ادب میں ایک کیٹس پیدا ہوا تھا جسے ترقی پسند بھیڑیئے اُٹھا لے گئے۔ کچھ یہی حال اردو افسانہ نگاری کے بین الاقوامی شہرت کے مالک فنکار سعادت حسن منٹو کے ساتھ بھی ہوا۔

منٹو غیر منقسم ہندوستان کی مردم خیز ریاست پنجاب کے ایک مشہور و معروف خطہ امرتسر میں ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے اور پھر ان کی قسمت تقسیم ملک کے بعد انہیں جنوری ۱۹۴۸ء میں نئی مملکت پاکستان لے گئی وہاں سے پھر وہ واپس ہندوستان نہیں آ سکے۔ پاکستان کے بہت ہی تاریخی مقام و مرتبے کے حامل لاہور شہر میں وہ پیوندِ خاک ہوئے۔ اس طرح وہ شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے ساتھ لاہور میں محوِ استراحت ہیں۔ سعادت حسن منٹو کے بارے میں ایک خاص بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ جنوری کے ماہ میں انہوں نے پاکستان کے لیے ہجرت کی تھی اور جنوری کے مہینے میں ہی ۱۹۵۵ء میں انہوں نے وہیں انتقال کیا، انتقال کے وقت ان کی عمر تقریباً بیالیس (۴۲) سال تھی۔

لاہور میں جب سعادت حسن منٹو کا انتقال ہوا تو اس قت ان کی عمر اسرار الحق مجاؔز سے بھی کم تھی لیکن ہم اسے قدرت کی کرشمہ سازی کے طور پر ہی دیکھتے ہیں کہ ان کے گروپ اور ساتھ کے افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس جنہوں نے طویل عمریں گزار کر اس فانی دنیا کو خیر باد کہا اس کے باوجود ان کے مقابلے میں کم عمری کی موت پانے والے سعادت حسن منٹو بازی مار لے گئے۔ کیونکہ اپنے ساتھ افسانہ نگاروں میں یہ اعزاز صرف اور صرف منٹو کو حاصل ہوا کہ آج بین الاقوامی سطح پر ان کی صدی منائی جا رہی ہے۔ ہندوستان کی تمام زبانوں کے جرائد و اخبارات میں ان کی شخصیت اور فن پر مضامین اور مقالے قلمبند کئے جا رہے ہیں۔ دنیا میں جہاں جہاں اردو کی بستیاں آباد ہیں وہاں وہاں ان کی یاد میں جلسے اور سیمینار انعقاد پزیر ہو رہے ہیں۔ یہ مقام

ومرتبہ سب کی قسمت میں کہاں ودیعت کیا جاتا ہے اسی لئے تو ہم کہتے ہیں کہ موت کوئی کردار ادا نہیں کرتی اصل معاملہ تو قدرت کی کرشمہ سازی کا ہوتا ہے۔

اب یہی دیکھ لیجئے کہ انگریزی کا شاعر کیٹس (Keats) بائیس سال کی غیر پختہ عمر میں داغ مفارقت دے گیا تھا لیکن اس کے باوجود انگریزی زبان و ادب کی کئی رومانی شاعری Romantic Poetry میں اس نے اپنا جو منفرد مقام بنایا وہ اسی کا حصہ تھا۔ ایک طریقے سے وہ ایک بے نظیر شخصیت کا مالک تھا۔ قدرت کے کارخانے میں اس طرح کے غایت درجے کے عجوبے رونما ہوتے ہی رہتے ہیں، لیکن یہ انسان ہی ہے جو قدرت کی مرضی کے خلاف جرم کا اِرتکاب کر کے اپنا خانہ خراب کرلیا کرتا ہے۔ اسرارالحق مجازؔ کو قدرت نے بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا لیکن انہوں نے بلانوشی کے زہر سے اپنے دل و دماغ کو مغلّظ کرلیا تھا اور یہی ام الخبائث تھی جس نے سعادت حسن منٹو کا بیڑا غرق کیا۔

سعادت حسن منٹو کے حالات و کوائف کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ان کا تعلیمی کیریر کچھ بہتر نہیں تھا کیونکہ ہائی اسکول کے طالب علم کی حیثیت سے وہ مسلسل دو بار فیل ہو چکے تھے۔ ایک بار بی اے سال اول کے امتحان میں بھی ناکامیاب ہوئے۔ دراصل انہیں اسکول اور کالج کے سقیم قسم کے تعلیمی نصاب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان کی ذہنی صلاحیت میں کوئی کمی تھی۔ دراصل تعلیمی نصاب کو ازبر کر کے امتحان پاس کرنا ایک بات ہے اور اپنی پسند کے کام میں دلچسپی لینا اور بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کرنا دوسری بات۔ ورنہ یہ تسلیم کرنے والی بات نہیں کہ جس زبان میں انہوں نے آگے چل کر بڑے دھماکہ خیز اور تحقیقی انداز کے افسانے، ڈرامے اور خاکے سپردِ قلم کئے اُسی زبان کے امتحانی پرچے میں انہیں ناکامیابی کیونکر حاصل ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اردو زبان کا کوئی امتحان دینا ان کے لیے کوئی مرغوب شغل نہیں تھا بلکہ اردو زبان میں ان کو اپنا اعلیٰ تخلیقی جوہر دکھانے کا والہانہ شوق اور ولولہ تھا۔ اور اپنے اس شوق اور ولولے میں انہیں آدھی ادھوری کامیابی نہیں بلکہ پوری کی پوری کامیابی ہاتھ لگی۔ چنانچہ آج

جب ہم ان کی صدی بین الاقوامی سطح پر منا رہے ہیں تو ہمیں حد درجہ مسرت ہو رہی ہے کہ سعادت حسن منٹو اسی زبان کے تخلیق کار تھے جس کا امتحان بھی وہ پاس نہیں کر سکے تھے۔

سعادت حسن منٹو نے اپنے لڑکپن میں ہی قلم و قرطاس سے گہرا رشتہ استوار کر لیا تھا چونکہ ان کا ذہن شروع سے ہی انقلابی تھا اس لیے ہر ناپسندیدہ چیز سے وہ بغاوت پر کمر بستہ ہو جاتے تھے۔ وہ جس ریاست میں پیدا ہوئے تھے اس کا نام پنجاب تھا اس زمانے میں وہاں کے لوگوں کے ذہنوں میں انقلاب کا جذبہ رچا بسا ہوا تھا۔ اس وقت وہاں کا ہر انقلابی سوویت روس کی طرف نظریں جمائے ہوئے تھا۔ جہاں کارل مارکس نے ژارشاہی کے خلاف علَم بغاوت بلند کیا تھا اور ژارشاہی کو شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا، منٹو اس وقت کارل مارکس اور گورکی سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ اتفاق سے انہی دنوں میں ''ماہنامہ عالمگیر'' کا روسی ادب نمبر شائع ہوا تھا۔

منٹو نے ڈاکٹر ہیوگو اور آسکر وائلڈ کے ڈراموں کا ترجمہ کیا۔ ان کے ان ترجموں کو اس نمبر میں شائع کیا گیا۔ پھر روس کے مشہور زمانہ ادیب و افسانہ نگار گورکی، چیخوف اور ترگنیف کے افسانوں کو انہوں نے دلچسپی سے پڑھا، ان کے افسانوں کے مطالعہ نے انہیں ان کا گرویدہ کر دیا اور ان کے تتبع نے منٹو کو بھی افسانہ نگاری سے قریب کیا اور نتیجے کے طور پر افسانہ نگاری کے میدان میں بہت تیزی سے ان کا ذہن چل پڑا۔ صرف سعادت حسن منٹو ہی نہیں بلکہ اس وقت کے تمام اشتراکی جنہوں نے ان کے ساتھ ہی افسانہ نگاری شروع کی کمیونسٹ روس سے درآمد کردہ کمیونسٹ نظریات کے طرفدار ہو گئے تھے ایسے تمام فنکاروں کی قیادت سجاد ظہیر (بنّے بھائی) کر رہے تھے۔

کہانی نویسی کے میدان میں اس وقت جس طرح کے افسانے ان کے ساتھی کہانی کار کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی وغیرہ لکھ رہے تھے اس سے اجتناب کرتے ہوئے سعادت حسن منٹو نے بالکل الگ راستہ اختیار کیا اور وہ راستہ متنازعہ فیہ تھا۔ ہم اسے تعمیری راستہ تو نہیں کہہ سکتے لیکن اب اس کا کیا جائے کہ منٹو کو

وہی راستہ پسند آیا۔ سوال یہ ہے کہ وہ راستہ کون سا تھا اس کا جواب ہم یہ دیں گے کہ وہ راستہ عریانی اور فحاشی کا راستہ تھا۔ طوائفوں کی مخدوش اور گھناونی زندگیوں میں جو کچھ ہوتا تھا، ان سے اپنے جنسی تلذذ اور عیاشی کی آگ بجھانے والے گاہکوں کے بارے میں وہ جو کچھ محسوس کرتے تھے اس کو بعینہ ویسا اپنے افسانوں میں پیش کیا کرتے تھے لیکن اس بات کا خیال رکھا جائے کہ سماج کی جن طوائفوں کو منٹو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے تھے وہ طوائفیں مرزا ہادی رسوا کی طوائف امراؤ جان ادا سے بالکل مختلف ہوتی تھیں۔

ان کا محض اس بنا پر موازنہ ہوسکتا ہے کہ دونوں کو ہم طوائف کے ہی زمرے میں رکھتے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جس زمانے کے لکھنوی معاشرے کی طوائف امراؤ جان ادا کا مرزا ہادی رسوا نے اپنے ناول میں نقشہ کھینچا ہے اس کا معاملہ کچھ اور تھا۔ وہ سراپا تہذیب و تمدن تھی۔ وقت کے بڑے بڑے شرفا، اور تہذیبی اقدار کے مالک جوانانِ لکھنؤ اس کے دولت کدے پر جانے سے گھبراتے تھے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ لکھنؤ کے بہت سے خاندان کے لوگ اپنے لڑکوں کو طریقۂ زندگی سے آشنائی حاصل کرنے کی غرض سے امراؤ جان ادا کے پاس بھیجتے تھے۔ امراؤ جان ادا کو مرزا ہادی رسوا نے علامت کے طور پر استعمال کیا ورنہ بیشتر طوائفیں اسی قماش کی تھیں۔ لیکن منٹو کی طوائفیں امراؤ جان ادا سے بالکل الگ شناخت رکھتی تھیں۔

سعادت حسن منٹو کی طوائفیں بدکاری، بدچلنی اور بدتہذیبی کا بدبودار مرقع ہوتی تھیں۔ ان کے بہت ہی مشہور افسانے 'ہتک'، 'کالی شلوار'، 'بو' اور موزیل وغیرہ ہیں 'ہتک' میں سوگندھی کا کردار انسانیت کے ماتھے کا کلنک ہے 'کالی شلوار' کی طوائف سلطانہ اور 'بو' کی گھاٹن لڑکی کے کردار بھی اس سے کچھ الگ نہیں ہیں۔ ان سب کے کردار حد درجہ کریہہ اور گناہ آلود ہیں اُن کے اِن افسانوں پر بڑی بے چینی محسوس کی گئی اور ان پر پے در پے عدالت میں کئی مقدمات چلے۔

ادھر ترقی پسند تحریک کے ارباب بست وکشاد نے ایک میٹنگ میں ان کے خلاف

تجویز پاس کی اور انہیں رجعت پسند کہہ کر ان سے دوری اختیار کر لی۔ یہاں ترقی پسند تحریک کا رویہ ہمارے خیال سے مناسب نہیں تھا کیونکہ منٹو پر رجعت پسندی کا لگایا جانے والا الزام اس وقت صحیح ہوتا جب انہوں نے اپنے قبیلے کی ایک مشہور و معروف خاتون افسانہ نگار عصمت چغتائی کے بدنام زمانہ افسانہ 'لحاف' لکھنے پر ان کی بھی سرزنش کی ہوتی اور ان کو بھی رجعت پسند کہہ کر ان سے دوری بڑھائی ہوتی۔ منٹو کے مطابق انہوں ں نے طوائفوں پر افسانے اس لیے لکھے تا کہ سماج کی اس برائی کا قلع قمع کیا جا سکے اور عصمت چغتائی نے اپنے غلیظ افسانہ 'لحاف' میں کون سی برائی سے برأت حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اگر ترقی پسند تحریک کے لوگ منٹو کے ایسے افسانوں کو سماج اور معاشرے کے لیے نقصان دہ سمجھتے تھے تو ایسی صورت میں پیار اور محبت سے انہیں سمجھاتے۔ ان کے اس اقدام سے ممکن ہے منٹو کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہو جاتا اور وہ اپنی ایسی تحریروں سے توبہ کر لیتے لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔

منٹو نے ترقی پسند تحریک کے ذمہ دار لوگوں کے اس طرزِ عمل سے دل افگار اور متنفر ہو کر تحریک کی سرگرمیوں سے ناطہ توڑ لیا اور اپنی الگ راہ بنالی۔ انہیں سماج کے نام نہاد ٹھیکیداروں سے ایک ضد پیدا ہو گئی۔ ان کی فطرت میں جو ضد اور ہٹ دھرمی آہستہ آہستہ پنپ رہی تھی اس میں شدت آ گئی منٹو کے جن افسانوں کو سماجی برائیوں کی جڑ بتا کر ان کا بائیکاٹ کیا جا رہا تھا، ان پر مقدمہ چلایا جا رہا تھا، ان پر جرمانے عاید کئے جا رہے تھے ان سے ہار نہ مان کر اور اپنے اندر کسی قسم کی سراسیمگی نہ پیدا کر کے وہ ایسے افسانے زور وشور سے لکھنے لگے۔ ان کے یہاں اعتدال پسندی تقریباً مفقود ہو گئی۔ ان کے ہر کام میں بے ترتیبی انجام پانے لگی، غالباً اسی لیے جب' کالی شلوار، بو، دھواں، اوپر نیچے درمیان، ٹھنڈا گوشت، خوشیا، میرا نام رادھا ہے، موذیل، نعرہ اور پھاہا وغیرہ ان کے افسانے یکے بعد دیگرے شائع ہوئے اور لوگوں نے ان پر تنقید شدید کر دی تو انہوں نے ان کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ'' اگر ویشیا کا ذکر فحش ہے تو اس کا وجود بھی فحش ہے اگر اس کا ذکر ممنوع ہے تو اس کا پیشہ بھی ممنوع ہونا چاہیے، ویشیا کو مٹاتے اس کا ذکر خود بخود مٹ جائے گا۔''

منٹو کی ہر تحریر کا سرنامہ ۷۸۶ ہوا کرتا تھا جو ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کی حسابی گنتی کا احاطہ کرتا ہے یہ ہمارا خیال ہے جو غلط بھی ہوسکتا ہے کہ ترقی پسند تحریک کے لوگوں نے ان پر رجعت پسندی کا جو الزام لگایا اسی کا نتیجہ تھا۔اس لیے کہ منٹو نے علی الاعلان کہا تھا کہ یہ اللہ میاں کا فون نمبر ہے اس سے ان کے مضبوط عقیدے کا اظہار ہوتا تھا ایسی صورت میں بھلا ترقی پسند مصنفین کو یہ بات کیونکر پسند آتی کیونکہ ترقی پسند مصنفین کے آقا کارل مارکس مذہب کے سخت مخالف تھے۔انہوں نے کہا تھا کہ مذہب افیون کی گولی ہے جسے کھلا کر لوگوں کوسُلا دیا جاتا ہے،ہم اس بات کا اعادہ پھر کرتے ہیں کہ یقین واعتماد کے ساتھ یہ نہیں کہتے کہ ترقی پسند مصنفین نے جب منٹو پر رجعت پسندی کا الزام لگایا تو اس کے پسِ پشت یہی ۷۸۶ کی بات رہی ہوگی۔

منٹو نے طوائف نگاری (طوائف نگاری کی اصطلاح ہم اس لئے استعمال کرر ہے ہیں کہ انہوں نے طوائفوں پر زیادہ سے زیادہ لکھا) کے تعلق سے جو مواد اور کردار جمع کیے تھے وہ سارے کے سارے ممبئ کے مخصوص علاقوں کینڈی برج، فارس روڈ، گرانٹ روڈ، اور عرب گلی وغیرہ کے پاس کے تھے۔انہوں نے ممبئ میں تقریباً نو سال گزارے اتنی مدت میں انہوں نے افسانوں کے ڈھیر لگادیئے اس لیے کہ پنجاب سے انہوں نے سیدھے ممبئ کا رُخ کیا تھا۔ممبئ میں نو سال کے قیام کے بعد وہ دہلی چلے گئے ایسا انہوں نے معاشی تنگ دستی کے پیشِ نظر کیا تھا۔اور دلی سے پھر وہ لاہور چلے گئے۔اپنی مختصر عمر میں انہوں نے جتنے افسانے لکھے انہیں ان کے افسانوی مجموعوں' دھواں، لذّتِ سنگ، نمرود کی خدائی، خالی بوتلیں خالی ڈبے، یزید، سیاہ حاشیے، چغد،سڑک کے کنارے ،منٹو کے افسانے ، ٹھنڈا گوشت،اور' بادشاہت کا خاتمہ' میں پڑھا جاسکتا ہے۔

منٹو کے افسانوں میں اکثر و بیشتر کئی کئی ڈرامائی موڑ آتے ہیں جو قاری کی دلچسپی میں اضافہ کرتے ہیں،منٹو جب اپنے افسانوں کا تانا بانا تیار کرتے تھے تو تکنیک کا بڑا اہتمام کرتے تھے اس لیے کہ تکنیک سے افسانہ نگاری کا انداز خاصا بے ساختہ ہوجاتا ہے اس

معاملے میں وہ معاصر افسانہ نگاروں سے بہت آگے تھے اس کے ساتھ ہی ساتھ مواد اور جزویات سے بھی وہ صرف نظر نہیں کرتے تھے، ان سب خصوصیات نے مل کر انہیں اپنے عہد کا ممتاز افسانہ نگار بنا دیا تھا۔ تقسیم ملک کے بعد انہوں نے 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' کے عنوان سے جو افسانہ لکھا اسے تقسیم کے موضوع پر لکھے جانے والے افسانوں میں سب سے بہتر قرار دیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے ایک افسانہ 'نیا قانون' لکھا تھا اگرچہ یہ افسانہ ان کے ابتدائی افسانوں میں تھا لیکن اس وقت کے افسانوی انتخابات میں وہ اکثر شامل ہوتا تھا دوسرے یہ کہ 'نیا قانون' کا تعلق طوائفوں سے نہیں تھا، منٹو کی افسانہ نگاری کا ایک خاص وصف یہ ہوتا تھا کہ وہ اس پر کبھی نظر ثانی نہیں کرتے تھے۔ اس سے ان کی ذہنی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

افسانوں کے ساتھ ساتھ منٹو نے بہت سے مضامین اور خاکے بھی لکھے تھے۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ 'گنجے فرشتے' کے نام سے شائع ہوا اور مضامین کا مجموعہ 'منٹو کے مضامین' کے عنوان سے گنجے فرشتے کے نام سے خاکوں کا جو مجموعہ انہوں نے شائع کیا ویسا مجموعہ اردو میں ابھی تک نہیں آ سکا ہے۔ اس کے بارے میں منٹو کی اپنی رائے یہ تھی کہ اس میں جو بھی فرشتہ آیا اس کا منڈن کر دیا گیا ہے۔ منٹو اور احمد ندیم قاسمی کی دوستی محکم بنیادوں پر قائم تھی انہوں نے جو خطوط قاسمی کو لکھے انہیں کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ منٹو کی اہلیہ صفیہ کو احمد ندیم قاسمی پر بڑا بھروسہ اور اعتماد تھا، عمر کے آخری دِنوں میں جب منٹو کی شراب نوشی نے تمام حدیں پار کر دی تھیں تو انہیں راہِ راست پر لانے کا فریضہ قاسمی صاحب ہی انجام دیتے تھے۔ ہر فرشتے کا مُنڈن تو منٹو نے کیا، لیکن اپنے معصوم بال بچوں کی پروا اُنہوں نے بالکل نہیں کی۔

بُھونک کر بتانے والی بات
''ٹیٹوال کے کتے کی کہانی خود اس کی زُبانی''

اس کا اعتراف شروع ہی میں کرتا چلوں کہ دورانِ گفتگو کہیں کوئی سخن گسترانہ بات آجائے تو خدارا یہ مت کہیے گا کہ جس نے بھونکنا سکھایا، اسے ہی کاٹنے دوڑ رہا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ ساہتیہ اکادمی کی شائع کردہ کتاب ''پاکستانی افسانے'' (مرتب انتظار حسین، آصف فرخی) میں ومٹو صاحب کو پاکستانی افسانہ نگار کی حیثیت سے نشان زد کرنے کے بعد ان کی قومی اور ثقافتی شناخت کو لے کر بحث کے نئے باب وا ہو گئے ہیں۔ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' اور ''کھول دو'' جیسی کہانیاں لکھنے والے فنکار کو ہم کیا کہیں گے؟ ہندوستانی یا پاکستانی؟ نہیں نہیں گھبرایئے نہیں میں اس کتا خصی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا لیکن اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ..... مگر ٹھہریئے، اپنی بات شروع کرنے سے پہلے اپنا پورا پریچئے آپ لوگوں کو دے دوں۔ فرنگیوں کی زبان میں کہوں تو Introduction یعنی کہ تعارف.. کہنے کو تو میں ومٹو صاحب ... ہاں.. ہاں.. مجھے معلوم ہے ان کا نام ومٹو صاحب نہیں سعادت حسن منٹو ہے۔

مگر جب ممد بھائی منٹو صاحب کے بجائے انہیں ومٹو صاحب کہہ سکتا ہے تو میں کیوں نہیں۔ میں بھی تو ممد بھائی کی طرح ان کے افسانے کا ایک کریکٹر ہوں۔ مانا ممد بھائی کی طرح ورلڈ فیمس نہیں ہوں۔ کیوں؟ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ انسانوں کے بجائے ومٹو صاحب نے مجھے کُتے کی جون میں خلق کیا۔ اور پھر، اپنے کو تو وہ بخت بھی نہیں ملی جو سوگندھی کے کتے کے نصیب میں آئی۔ آپ کو معلوم، اردو کے ایک نام چین شاعر نے تو سوگندھی کے کتے پر ایک اکھی کویتا لکھی اور ایک اپنا نصیب! کویتا چھوڑ و اردو کا کوئی نقاد جھوٹے منہ... منہ لگانے کو تیار نہیں۔ ترقی پسند ناقدوں نے تو مجھے ہمیشہ دہلیز کے باہر رکھا اور تو اور ومٹو صاحب

کے افسانوں میں ابھرنے والے تصور انسان کو مگنیفائی گلاس سے دیکھنے والی ممتاز شیریں نے تو اپنی کتاب ''منٹو نوری نہ ناری'' سے مجھے ڈنڈے سے ہانک کر باہر کر دیا۔ایک بے چارہ وارث علوی ہی ہے جو وقت بے وقت اپنے مضامین میں منٹو صاحب کے غیر مقبول افسانوں کی نہ صرف تفسیر، تعبیر اور تشریح کرتا رہتا ہے بلکہ منٹو شناسی کے باب میں ایک سازگار فضا بھی ہموار کرتا جا رہا ہے۔

سچی بولوں میں تو ابھی خالی وارث علوی کی نظر التفات کا منتظر ہوں۔ دیکھئے اپنا نمبر کب آتا ہے؟ ہاں تو میں اپنے بارے میں بول رہا تھا کہ جات کا کتا ہوں اور رہنے والا ٹیٹوال کا ہوں۔ جی ہاں بالکل ٹھیک پہچانا۔ ٹیٹوال کا کتا....وہی ٹیٹوال جو انڈیا اور پاکستان کے بارڈر پر موجود ہے۔ میرا نام..؟.وہ مت پوچھو تو ہی اچھا ہے۔ منٹو صاحب چاہتے تو کوئی اچھا سا نام رکھ سکتے تھے میرا...... پر نام دیا بھی تو کیا....چپڑ جھن جھن ...آپ نے سُنا ہے کسی شریف آدمی کا.....معاف کرنا کسی شریف کتے کا ایسا نام۔ چپڑ جھن جھن ...ستم یہ نہیں کہ انہوں نے میرا نام چپڑ جھن جھن رکھا ستم بالائے ستم یہ ہے کہ یہ نام خالی انڈیا کے لئے محدود رکھا ۔ پاکستان کے لئے دوسرا واہیات نام تھا.... سپڑ سُن سُن ...بھلا، بھلے ناموں کی کمی تھی منٹو صاحب کے پاس؟ چپڑ جھن جھن ...سپڑ سُن سُن .. پہلے پہل تو طبعیت بہت جھلائی بلکہ بولائی ۔سوچا، منٹو صاحب نے میرے ساتھ ایسا فراڈ کیوں کیا؟

ممد بھائی سے لے کر موذیل تک اور بابو گوپی ناتھ سے لے کر سوگندھی تک اپنے کرداروں کے کتنے پیارے پیارے نام رکھے منٹو صاحب نے....یہی نہیں ''کتے کی دعا'' اس نام کے افسانے میں انہوں نے شیخ صاحب کے کتے کا نام گولڈی رکھا اور ادھر میرے نام کو منٹو صاحب نے تمسخر سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ مگر جب اپنے نصیب پر غور کیا تو چپڑ جھن جھن ...سپڑ سُن سُن ..ان ناموں کے اسرار کا پتہ چلا۔ میری کہانی ان ناموں کے ڈائکیما کے بیچ میں ہی کہیں چھٹ پٹا رہی ہے ۔نام سے میرے نصیب کا جو سمبندھ ہے وہ افسانے کے معنیاتی نظام اور اس کے پورے فارم میں پھیلا ہوا ہے۔ میرے خیال میں میرا نام تجویز

کر کے ومنٹو صاحب نے ایک طرف میری destiny رقم کی اور دوسری طرف افسانے کی سمت بھی بدل دی۔ جی ہاں! غور کیجئے گا سپاہیوں کی رومانی یادوں پر رواں دواں افسانہ میرے نام کے ساتھ ہی اچانک استہزایہ بلکہ پیروڈی کی سطح پر اتر آیا۔ میرے نام میں جو صوتی اور لسانی ترکیب ہے وہ میرے بھوندو پن کے ساتھ ساتھ میرے کردار کے comical dimension کی مظہر بھی ہے۔

لگتا ہے جیسے ومنٹو صاحب نے کسی عورت کے حسن کی تعریف کرتے کرتے اچانک اس کے رُخسار کو بندر کے پیٹ سے تشبیہ دے دی ہو۔ ہوسکتا ہے انتظار حسین اسے بھی ومنٹو صاحب کی ''چونکاؤ ذہنیت'' کا کرشمہ کہیں؟ مگر حقیقتاً ومنٹو صاحب کا مقصد چونکانے سے زیادہ افسانے کے ردھم اور رفتار سے متعلق اپنے قاری کو چوکنا و چوکس کرنے کا تھا۔

چپڑ جھُن جھُن ... سپڑ سُن سُن ...اس کا کیا مطلب ہے یہ تو میں نہیں جانتا مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ یہ بے مطلب نہیں ہے۔ کم سے کم افسانوی فریم ورک میں ...ومنٹو صاحب کا یہی کمال تھا بے معنی چیزوں میں بھی وہ معنی کھوج نکال لیتے تھے کہ لغت بے چاری منہ تکتی رہ جاتی تھی۔ اب آپ ہی کہئے نا! ٹوبہ ٹیک سنگھ میں بشن سنگھ کی اس بات کا کیا مطلب ہے؟

''اوپڑی گڑگڑ دی اینکسی دی بدھیانہ دی مونگ

دی دال آف دی لالٹین''

مگر حضور والا! کیا ٹوبہ ٹیک سنگھ کے یہ فقرے بے معنی ہیں۔ بظاہر بے ربط جملوں میں معنویت کا جہاں آباد ہے جسے محسوس تو کیا جا سکتا ہے مگر حرفاً حرفاً بیان نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' اور ''ٹیٹوال کا کتا'' دونوں افسانے ایک ہی تخلیقی رویّے کے دو اسلوبیاتی مظہر ہیں۔ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' میں مذہب کے نام پر ہونے والی اس مضحکہ خیز تقسیم کو ومنٹو صاحب نے اگر ایک پاگل کے حوالے سے بیان کیا ہے تو ''ٹیٹوال کا کتا'' میں قومیت کے نام پر ہونے والی بہمیت کو ایک کتّے کی موت کے وسیلے سے.... یعنی کہ جس زمین پر ٹوبہ ٹیک سنگھ نے دم توڑا تھا اسی No men's land پر مجھے قتل کیا گیا۔ یہ تو ہوئی میری موت کی بات۔ مگر میرا

جنم......؟ جنم کہاں ہوا تھا؟ یہ پتہ لگانے کی میں نے کبھی کوشش نہیں کی۔ کیوں کرتا؟'' اپڑ ی گڑ گڑ دی اینکسی دی بدھیانہ دی مونگ دی وال آف انتظار حسین'' آخر کتا ہوں انسان تھوڑے ہی ہوں جو اپنی جڑوں کے لئے پریشان رہتا۔ اپنے کو تو جہاں روٹی، ہڈی ملے وہی اپنی ٹھیا...

تقسیم ہند اور فسادات کا موضوع ومنٹو صاحب کے افسانوں میں ایک مستقل عنوان کی حیثیت رکھتا ہے۔ سرحدوں کی جو بے رحم لکیر نفرتوں نے کھینچی تھی ومنٹو صاحب کا آرٹ اس کی سختی سے تردید کرتا ہے۔ فسادات کو ومنٹو صاحب نے بلاشبہ بھینچی ہوئی مُٹھیوں اور پھٹی ہوئی آنکھوں سے دیکھا تھا مگر ترقی پسند افسانہ نگاروں کی طرح انہوں نے اپنے افسانوں میں جذبات کو انڈیلنے کے بجائے اپنی شخصیت کی ترکیبی قوّتوں سے آمیز کر کے اس کی لسانی دریافت کی۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ، کھول دو، ٹھنڈا گوشت، ڈارلنگ، آخری سیلوٹ، موذیل، گورمکھ سنگھ کی وصیت اور سیاہ حاشیے کے افسانے موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے یوں کامیاب ہیں کہ اتنی مدّت گزر جانے کے بعد آج بھی ان کی ہولنا کی قائم ہے۔

ومنٹو صاحب نے جس وقت میری کہانی پر افسانہ لکھا کہتے ہیں اس وقت وہ اپنی زندگی کے black patch سے گزر رہے تھے۔ پیسوں کی تنگی اور شراب کی ضرورت نے انہیں روز آنہ ایک افسانہ لکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ سن ۱۹۱۹ء کی ایک بات، گورمکھ سنگھ کی وصیت، یزید، ٹیٹوال کا کتا یہ سبھی افسانے شراب کی ایک بوتل کے حصول کے لئے لکھے گئے افسانے ہیں۔ ذہنی، معاشی، جذباتی بکھراؤ کے باوجود ومنٹو صاحب نے اس دوران جو افسانے لکھے ان میں کوئی الجھاؤ نہیں اور نہ ہی کوئی نقش دُھندلا یا کہر آلود ہے۔

سبھی افسانوں میں شروع سے آخر تک چُستی اور تلوار کی سی صفائی اور تیزی ہے۔ معلوم ہوتا ہے ایک ایک حرف تول تول کر لکھا ہے۔ ''ٹیٹوال کا کتا'' ومنٹو صاحب کا ایک ایسا ہی افسانہ ہے۔ جو ان کے بہترین افسانوں میں نہ سہی مگر اہم افسانوں میں سے ضرور ہے۔ ایسے وقت میں جب ومنٹو صاحب ذاتی طور پر اپنے گرد و پیش کی زندگی کی بے معنویت کو

اس قدر شدّت سے محسوس کر رہے تھے، ان کا تخلیقی رشتہ اپنے آس پاس کی زندگی سے برابر قائم رہا۔ تاہم اس سے یہ کلیہ قائم نہیں ہوتا کہ شعورِ عصر ہی فنکارانہ قوّت اور عظمت کی ضمانت ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو تھوک کے بھاؤ سے ترقی پسند افسانہ نگاروں نے جو افسانے لکھے ہیں آج وقت کا عفریت انہیں ہڑپ نہ کر چکا ہوتا۔

''ٹیٹوال کا کتا'' یہ افسانہ انہوں نے ۱۹۵۵ء میں لکھا جو بجائے خود ثبوت ہے کہ سات سال گزر جانے کے بعد بھی تقسیم کے زخم مندمل نہیں ہوئے تھے۔

حیرت ہوتی ہے کہ ٹیٹوال کا کتا جیسی کہانی لکھنے کے باوجود حسن عسکری ومنٹو صاحب کو اپنے ادبی موقف کی زنجیریں پہنانے اور انہیں اسلامی ادب کا مبلغ ثابت کرنے کے لیے مسالہ جٹا رہے تھے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ومنٹو صاحب کی تخلیقی سرشت کسی بھی سیاسی، سماجی اور لیٹر یری تھیوری کے کھونٹے سے بندھنے کو تیار نہیں تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ '' آ گل'' راستہ نہ ملنے کی وجہ سے ومنٹو صاحب ''باجو کی گلی'' سے چپ چاپ پاکستان چلے گئے تھے۔ اب جناب فتح محمد ملک یہ نہ کہہ دیں کہ چلے آئے تھے۔ خیر ان کا بس چلے تو بقول محمد عاصم بٹ ومنٹو صاحب کا کرتا اور پائجامہ اُتار کر انہیں شلوار قمیض اور شیروانی پہنا دیں۔ سچّی بات تو یہ ہے کہ فتح محمد ملک اتنی سی بات نہ جان سکے مملکتِ خداداد چلے جانے یا چلے آنے کے باوجود ومنٹو صاحب نے مرتے دم تک تقسیم کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ تاریخ کا یہ بے رحم فیصلہ مستقبل میں کیا کیا جلوے دکھانے والا ہے ''ٹیٹوال کا کتا'' اس کی پہلی جھانکی ہی نہیں اس فیصلے repercussion کو سمجھنے کی ایک فنکارانہ کوشش بھی ہے۔

افسانے کی کہانی بہت ہی سیدھی سادی ہے اور اس کا اسٹرکچر بھی لگ بھگ سپاٹ سا ہے جو دو قومی نظریئے کے مقابلے میں واضح اور سیکولر نقطہ نظر کو پیش کرتی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ومنٹو صاحب وہی بات کہہ رہے ہیں جو اس وقت ترقی پسندوں اور ان کے ہمنواؤں میں مقبول رہی ہے۔ یعنی تقسیم کے جلو میں آنے والی مذہبی اور قومی منافرت.....

یہی نہیں افسانہ میں واقعہ کا juxtapose بھی دو اور دو چار والی پلاننگ سے آزاد نہیں۔ واقعات کی بُنت میں جو ایک اقلیدس (Geometry) ہے اس سے افسانے کا بظاہر رشتہ ترقی پسند روایت سے قائم ہوتا ہے۔ کہنے کو تو اس افسانے میں غیر جانب داری والے ترقی پسند برانڈ کے ترازو کی جلوہ گیری بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ جس سے حسن عسکری اور ممتاز شیریں کو چڑھ تھی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ منٹو صاحب اور ترقی پسندوں کے مابین قربت کا یہ رشتہ محض سطحی مشابہت سے زیادہ حکم نہیں رکھتا۔ منٹو صاحب کی نظر کا کمال ہی یہ تھا کہ وہ زندگی کے پیش پا افتادہ مسائل میں انوکھے اور حیرت انگیز پہلو ڈھونڈ لیتی تھی اور واقعہ کو ایک نئے فنی تجربے میں ڈھال دیتی تھی۔ منٹو صاحب کا فنی اسلوب سپاٹ حقیقت نگاری کے گریز سے عبارت ہے مگران کے بیشتر افسانوں کی طرح اس افسانے میں بھی سطح پر تیرتا ہوا جو سپاٹ پن نظر آتا ہے وہ اصل میں معروضیت قائم رکھنے کا ایک فنکارانہ حیلہ ہے۔

افسانے کی جائے وقوع ایک خوبصورت وادی ہے۔ منٹو صاحب نے افسانے کی شروعات میں ایک رومانی کینوس تیار کیا۔ جو بظاہر افسانوی موضوع اور فریم ورک سے بہت زیادہ میل نہیں کھاتا۔ جنگلی پھولوں نے پوری فضا کو مہکا دیا ہے بلند و بالا پیڑ، چڑیوں کی چہچہاہٹ، سہانا موسم، اونگھ اونگھ کر پھولوں کا رس چوستی سست رو شہد کی مکھیاں، کھلے آسمان پر تیرتے بادل، کسی وقوعہ کے انتظار میں اکتائے، کوفت کو کم کرنے کے لیے اوٹ پٹانگ باتیں کرتے، گیت گاتے سپاہی، یہ ہے وہ سینیریو جو کسی رومانی فلم کی طرح ابھرتا ہے۔ افسانے کی اٹھان سے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ منٹو صاحب جنگ و جدل کی سرحدوں پر تعینات سپاہیوں کی گمشدہ محبت کی کوئی کہانی سنانے جا رہے ہوں۔

> ''کئی دن سے طرفین اپنے مورچے پر جمے ہوئے تھے۔
> دن میں ادھر ادھر سے دس بارہ فائر ہو جاتے جن کی آواز
> کے ساتھ کوئی انسانی چیخ بلند نہیں ہوتی تھی۔''
> ''جب پہاڑیوں میں کسی فائر کی آواز گونجتی تو

چہچہاتے ہوئے پرندے چونک کر اُڑنے لگتے جیسے کسی کا
ہاتھ ساز کے غلط تار سے جا ٹکرایا ہے اور ان کی سماعت کو
صدمہ پہنچانے کا موجب ہوا ہے۔ ستمبر کا انجام اکتوبر کے
آغاز سے بڑے گلابی انداز میں بغل گیر ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا
تھا کہ موسم سرما اور موسم گرما میں صلح صفائی ہو رہی ہے''

افسانے کی ابتدا میں ومٹو صاحب نے جو رومانی پس منظر تیار کیا ہے وہ منظر نگاری نہیں اور نہ محض موسم کا بیان ہے فائر کی آواز پر پرندوں کے چونک کر اُڑنے پر کسی ہاتھ کا ساز کے غلط تار سے ٹکرانے اور ستمبر اور اکتوبر کا گلابی انداز میں ایک دوسرے سے بغل گیر ہونے میں جو معنویت پوشیدہ ہے اس کا احساس افسانوی فریم ورک میں ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کے کئی رمز اور اشارے افسانے میں موجود ہیں جو افسانے کی مرکزی معنویت کی تشکیل بھی کرتے ہیں اور تکمیل بھی۔

''دونوں پہاڑیاں جن پر مورچے تھے قریب
قریب ایک قد کی تھیں۔ درمیان میں چھوٹی سی میز پوش
وادی تھی جس کے سینے پر ایک موٹا نالہ موٹے سانپ کی
طرح لوٹتا رہتا تھا۔''

ومٹو صاحب کا فنکارانہ تخیل فطرت کی تصویر کشی میں بھی سماجی اور سیاسی حوالے کس سجتا سے وضع کر لیتا ہے۔ ایک سادہ سی جغرافیائی تصویر میں ہمیں افسانے کی روپ ریکھا مل جاتی ہے۔ مگر افسانوی لینڈ اسکیپ پر میری انٹری کے ساتھ ہی افسانہ سیاسی روپ اختیار کر لیتا ہے۔ مجھے تو افسانے میں اپنی انٹری عجیب ڈھنگ سے ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ بالکل غیر متوقع (unexpected) بن بلائے مہمان کی طرح۔ کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا جیسے کسی نے مجھے دھکا دے کر افسانوی چوکھٹے میں داخل کر دیا ہو۔ دیکھا جائے تو اصلاً میری آمد کے بعد ہی افسانے کو حقیقی رفتار ملتی ہے۔ مگر سوال یہ ہے ومٹو صاحب جن کی دینیات میں ایک لفظ کا بھی

بے جا اور بے وجہ استعمال گناہ تھا اور دانستاً انہوں نے اپنے افسانے کو ہر اس تفصیل سے محفوظ بلکہ محروم رکھا جو اسے فنی کُل بنانے میں معاون ثابت نہیں ہوتی تھی۔ مگر مذکورہ افسانے کا ابتدائی ایک چوتھائی حصہ موسم کے بیان اور سپاہیوں کی باہمی گفتگو اور ان کی رومانی یادوں اور گیتوں پر جو محیط ہے اس کے افسانوی لینڈ اسکیپ میں کیا معنویت ہے؟ افسانے کی اصل تھیم سے اس کا کیا ناطہ ہے؟

''منٹو صاحب نے ایک بار کہیں لکھا تھا کہ ''افسانے کا پہلا جملہ میں لکھتا ہوں اور بقیہ افسانہ وہ جملہ لکھواتا ہے''

تو کہیں ایسا تو نہیں کہ منٹو صاحب اصل میں کہانی تو سپاہیوں کی رومانی زندگی پر لکھنے جا رہے تھے اور لکھ گئے میری کہانی۔ وہی والمیکی والا قصہ ....لوگ کہتے ہیں کہ والمیکی نے رامائن شروع کی تھی بھگوان رام کی کتھا لکھنے کے لیے مگر وہ لکھ گئے سیتا میا کی کہانی، کہیں یہی گھپلا منٹو صاحب کے ساتھ تو نہیں ہوا؟ نہیں جناب ایسا ہے نہیں۔ رومانی ماحول اور تفاصیل کو افسانے کے ابتدائی حصے میں مسلط کرنا منٹو صاحب کے فراڈ کا ایک فنکارانہ حصہ ہی ہے۔

اس رومانی فضا اور پس منظر کا گہرا معنوئی رشتہ ان سپاہیوں کی زندگی کی بنیادی صداقتوں اور ان کے وجود میں نہاں فطری بربریت سے ہے۔ فطرت کے روبرو قومیّت اور مذہب کے عنوان سے قائم ہونے والی نفرتوں کے خیمے کس قدر بے تکے اور مضحکہ خیز ہیں منٹو صاحب نے فطرت کے بیان سے ان میں معنیاتی تہہ داری اور گہری تخلیقیت قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ دونوں طرف کے سپاہی کھوکھلے اور debase ہو چکے ہیں۔ ''کتا، کتے کا بیری ہے'' یہ کہاوت تو بنی نوع انسان نے ہم کتوں کے لیے گڑھی ہے مگر یہ خود ان پر جتنے بھیمانہ اور مضحکہ خیز طریقے پر منطبق ہوتی ہے کسی اور پر نہیں۔

Ironic situation یہ ہے کہ دونوں طرف کے سپاہی ایک دوسرے سے اس قدر مشابہت اور مماثلت رکھتے ہیں کہ ایک ہی دال کے دانے معلوم ہوتے ہیں۔ منٹو صاحب نے اس افسانے میں کرداروں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی ہے۔ کرداروں کو ان کی انفرادیت

کے حوالے سے دریافت کرنے کے بجائے ان کی شخصیت کا دُھندلا تاثر دینے کی کوشش کی ہے۔ومثو صاحب نے ان کرداروں کی داخلی زندگی میں رونما ہونے والے conflicts کو منہا کرتے ہوئے ان کا ہاڑ مانس اور روح، چھین کر انہیں ایک تجرید میں منتقل کر دیا ہے۔یہی نہیں ومثو صاحب نے کرداروں کے جو نام رکھے ہیں وہ بھی ان کے وجود کی شناخت نہیں بلکہ ان کے وجود کی علامت ہیں۔اور شاید اسی لیے دلچسپ حد تک ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہیں۔اُس طرف صوبیدار ہمت خان، اِس طرف جمعدار ہرنام سنگھ ہے۔ایک طرف سپاہی بشیرا ہے تو دوسری طرف بنتا سنگھ ہے۔ان سپاہیوں میں وہ فطری جوش اور ولولہ مفقود ہے جن سے سرحدوں پر تعینات سپاہیوں کی زندگی کے دن رات عبارت ہوتے ہیں۔

ناموں کی مشابہت کے علاوہ ان کی زندگی کے روز مرہ کے کام اور مشغولیات ایک دوسرے سے اس قدر مماثل ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کی پرچھائیں معلوم ہوتے ہیں۔دونوں طرف ایک طرح سے محبت کے گیت گائے جاتے ہیں اور ایک ہی طریقے سے ناشتہ تیار کیا جاتا ہے۔دونوں نہ صرف ایک ہی تاریخ، ایک ہی معاشرتی اور ثقافتی پس منظر لیے ہوئے ہیں بلکہ دونوں کی ادبی ولسانی معاشرت بھی سمان ہے۔اس مشترکہ اور طبعی حوالے کے back drop میں دونوں طرف کے سپاہیوں کے علاحدہ قومی اور سیاسی شناخت کے اصرار کی مصنوعی چھپٹ پٹاہٹ کو ومثو صاحب نے black humour کے ذریعے طشت از بام کیا ہے۔پورا افسانوی اسلوب ایک ایسی زمین پر پرورش پاتا ہے جہاں المیئے اور طربیے کی سرحدیں ملی ہوئی ہیں۔

> ''کتا دُم ہلاتا ہرنام سنگھ کے پاس چلا گیا اور یہ سمجھ کر کہ شاید کوئی کھانے کی چیز پھینکی گئی ہے زمین کے پتھر سونگھنے لگا۔جمعدار ہرنام سنگھ نے تھیلا کھول کر ایک بسکٹ نکالا اور اس کی طرف پھینکا۔کتے نے سونگھ کر منہ کھولا لیکن ہرنام نے لپک کر اُسے اُٹھا لیا۔''ٹھہرو کہیں پاکستانی تو

نہیں!''

سب ہنسنے لگے۔سردار بنتا سنگھ نے آگے بڑھ کر کتے کی
پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور جمعدار ہرنام سنگھ سے کہا۔''نہیں
جمعدار صاحب چپڑ جھن جھن ہندوستانی ہے''

جمعدار ہرنام سنگھ ہنسا اور کتے سے مخاطب ہوا''نشانی دِکھا
اوئے''

کتا دُم ہلانے لگا۔

ہرنام سنگھ ذرا کھل کے ہنسا۔''یہ کوئی نشانی نہیں۔دُم تو
سارے کتے ہلاتے ہیں''

بنتا سنگھ نے کتے کی لرزاں دُم پکڑی۔

''شرنارتھی ہے بے چارہ''

جمعدار ہرنام سنگھ نے بسکٹ پھینکا جو کتے نے فوراً دبوچ
لیا۔ایک جوان نے اپنے بُوٹ کی ایڑھی سے زمین
کھودتے ہوئے کہا۔''اب کتوں کو بھی یا ہندوستانی ہونا
پڑے گا یا پاکستانی''

اب آپ ہی بولو میں اس پر کیا کہتا....زبان ہلانے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی دم ہلا کر رہ گیا...میں تو ایک floating اکائی تھا۔نہ کاہو سے دوستی نہ کاہو سے بیر رکھنے والا.....
اتفاق سے سرحدوں کے بکھیڑے میں پڑ گیا۔چاہتا تو یہ تھا کہ سونٹھ کی ناس لے کر بیٹھا رہوں مگر دونوں طرف کے سپاہی مجھ جیسے ایک آوارہ کتے سے بھی قومیت کا مطالبہ اور اُمید کرتے ہیں۔دیکھا جائے تو میرے سر یکے آوارہ کتے کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے نہ کوئی ملک، نہ کوئی نام ہوتا ہے نہ کوئی چہرہ.....

لایعنی نفرت کی مضحکہ خیزی یہ ہے کہ دونوں طرف کے سپاہی مجھے نام اور چہرہ دینے

کے مشتاق ہیں۔ ''چیڑ جھن جھن'' اور ''سپڑ سُن سُن''.......اگر یہ نام ہیں تو بالکل ایسے نام ہیں جیسے جیل خانوں میں قیدیوں کے نمبر ہوتے ہیں۔ ہندوستانی سپاہیوں کے ''چیڑ جھن جھن'' کے جواب میں ''سپڑ سُن سُن'' ایک نیا نام اور پاکستانی ہونے کی citizenship کی تختی پاکستانی صوبیدار ہمت خان نے میرے گلے میں ٹانگ دی اور ادھر ہندوستانی مورچے کی طرف ہانک دیا، وہاں تعینات سپاہیوں نے مجھے دشمن کا آدمی سمجھا۔ جی ہاں! دشمن کا آدمی۔ میں اپنی دُم ہلا ہلا کر انہیں کہتا رہا کہ میں نہ دشمن ہوں اور نہ ہی آدمی۔ مگر انہوں نے میری ایک نہ سنی....اور میری ماں کو گالی دیتے ہوئے گولی داغ دی۔ یہ تو قسمت اچھی تھی کہ نشانہ چوک گیا اور میں جہاں تھا وہیں رُک گیا۔ نہ ایمان مجھے روک رہا تھا نہ کفر مجھے کھینچ رہا تھا مگر پھر بھی بوکھلا کر میں کبھی ادھر دوڑا تو کبھی ادھر۔ دونوں طرف سے ہونے والی گولیوں کی آواز نے مجھے بوکھلا سا دیا تھا۔ اور انجام کار.....میں ڈھیر ہو گیا۔ میں کہ جو استعارہ ہوں اس شرنارتھی کا جو محض ہندو ہونے کی وجہ سے اپنے پرکھوں کی وہ زمین چھوڑنے پر مجبور ہو گیا ہے جو اب پاکستانی جغرافیے کا حصہ ہے۔ یا پھر اس مہاجر کا جو مسلمان ہونے کے کارن اپنا گاؤں زمین جائیداد اور تاریخ چھوڑ کر مملکتِ خداداد کی طرف جا رہا ہے۔

کہانی اگر یہیں ختم ہو جاتی تو میں کہتا چلو بھائی قصہ صاف ہوا۔ اپنے آپ کو دھوبی کا وہ کتا مان کر سکون کی سانس لیتا جو آنکھوں پر پٹی باندھ کر زندگی بھر گھر اور گھاٹ کے بیچ میں اندھا بھینسا کھیلتا رہتا ہے۔ مگر جناب حقیقی زندگی محاوروں اور کہاوتوں کی زندگی سے زیادہ پیچیدہ ہوتی ہے۔ یونانی ڈرامہ کے المیہ ہیروؤں کی طرح میرا مقدر میرے پیدا ہونے سے پہلے ہی رقم کر دیا گیا تھا۔ لہٰذا مجھے اپنی موت کا افسوس نہیں، لیکن میری موت کسی کہانی کا انجام نہیں بلکہ شروعات ہے۔ ایک ایسے کھیل کی جو میری موت کے بعد اور ہولناک اور بہیمانہ ہو گیا۔ میرا المیہ یا طربیہ یا جو کچھ بھی آپ اسے کہیں میرے مرنے کے بعد ہی جی اٹھتا ہے۔ افسانے کے اختتامیہ جملے ملاحظہ ہوں۔

''کتا فائر سے گھبرا کر مُوا۔ ایک ٹانگ اس کی بالکل بیکار

ہو گئی تھی۔ باقی تین ٹانگوں کی مدد سے اس نے خود کو چند
قدم دوسری جانب گھسیٹا کہ جمعدار ہرنام سنگھ نے نشانہ
تان کر گولی چلائی۔ جس نے اُسے وہیں ڈھیر کر دیا۔
صوبیدار ہمّت خان نے افسوس کے ساتھ کہا۔
''چچ... چچ.... شہید ہو گیا بے چارہ''
جمعدار ہرنام سنگھ نے بندوق کی گرم گرم نالی اپنے ہاتھ میں
لی اور کہا۔'' وہی موت مرا جو کتّے کی ہوتی ہے۔''

دونوں مورچوں میں پھنسا ہوا میں ...ایک آوارہ کتا...ان کی گولیوں کا شکار ہونے کے باوجود ان کے جبر سے آزاد نہیں ہوا ہوں ۔یعنی زندگی کے routine سے اُکتائے اور وقت بے وقت فائر کر کے اپنی زندگی کو معنی دینے کی کوشش کرنے والے سپاہی اب میری موت کو معنی دینا چاہتے ہیں اور ان کے اندرون موجود تشدّد کبھی مذہب اور کبھی حُبّ الوطنی کے camouflage میں در آتا ہے۔ نصف صدی گزر جانے کے باوجود آج بھی میری موت ایک point of reference ہے۔اور یہی میری کہانی کا المناک بلکہ ہولناک پہلو ہے۔ میں کتّے کی موت مرا یا شہید ہوا؟ یہ سوال تو منٹو صاحب کو بھی پریشان کر رکھا تھا۔ اگر نہیں کرتا تو مجھ پر منٹو صاحب کہانی ہی کیوں لکھتے۔ اب آپ کہئے انسانی اقدار کے پھیلے ہوئے گوشوارے میں مَیں اپنی موت کو کیا عنوان دوں؟
بھوں.....بھوں.....

☆☆☆

م۔ناگ

منٹو،ایک سرسری جائزہ

سعادت حسن منٹو نے اپنی ڈگر خود تلاش کی۔منٹو جس زبان اور ادبی روایت میں لکھ رہا تھا اس میں فکشن کی روایت بہت پرانی نہیں تھی۔منٹو کو جو صلاحیتیں ودیعت ہوئی تھیں اردو کی روایت اس کے لیے کمزور تھی،اردو میں فکشن کے دیو قامت لکھنے والے اس بلندی تک نہیں پہنچے تھے جہاں منٹو کے آرٹ کو پہنچنا تھا۔

چونکہ منٹو سفاک سچائیاں قلم بند کرتا تھا۔شوگر کوٹنگ کا اس کے یہاں تصور نہیں تھا۔سچائی کو بیان کرنے والے کو بھی سچا بننا پڑتا ہے اور جھوٹے سماج میں سچا انسان زیادہ دیر تک نہیں ٹِک سکتا لیکن منٹو کو ۴۲ برس ۸ ماہ اور ۴ دن تک سماج کے زہر کو پینا تھا اپنی انانیت جو اس کے روم روم میں رچی بسی تھی اس سے شاید وہ ایک حفاظتی خول تیار کرتا تھا یا اسے ڈھال کی طرح استعمال کرتا تھا۔

منٹو کے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد فلم اداکار شیام اس کوٹھے پر پہنچا جہاں منٹو کو سوگندھی ملی تھی۔وہاں اب کوئی نہ تھا وہاں موجود ویشیاؤں نے پوچھا ''وہ منٹو منٹو کیا تھا اس کو بلاؤ'' شیام وہاں کسی سوگندھی کو نہیں ڈھونڈھ سکا کیونکہ سوگندھی کی کہانی تو صرف منٹو ہی سنا سکتا تھا کیونکہ وہ سوگندھی کی سطح پر اس کے اندرون میں اُتر سکتا تھا،سوگندھی کے وجود کا ڈر اور جھجک پیچیدگیاں اور تضاد اس کے اندرون کی تنہائی اور کرب کو منٹو نے اپنے آپ پر بھوگا تھا۔تب کہیں سوگندھی ''ہتک'' میں سانس لیتی تھی۔زندگی اور فطرت کو سمجھنے کے لیے منٹو بے چین رہتا تھا کہ اسے 'کالی شلوار'،'بابو گوپی ناتھ'،'ٹھنڈا گوشت' لکھنے تھے۔'بو' دھواں' اور 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' لکھنا تھا۔وارث علوی نے لکھا ہے کہ اگر منٹو ہتک نہ لکھتا تو اسے کبھی پتہ نہ چلتا کہ اکیلا پن اور تنہائی کیا ہوتی ہے اور جذباتی سروسامانی کیا ہوتی ہے؟

منٹو وقت اور زندگی کے آر پار گزرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس لیے تو اس نے زندگی کے ہر لمحے کو ایک تجربے میں ڈھال دیا تھا۔ راجندر سنگھ بیدی نے کہا تھا ''جب عرفان حاصل ہو جاتا ہے تو راستے کے پتھر بھی کہانی سنانے لگتے ہیں۔ منٹو پوری عمر اسی کیفیت سے گزرا، وہ خود پسند تھا لیکن اس کی طرح کی انانیت کو برداشت کرنے کا مادہ اس کے آس پاس کسی ذی نفس میں نہیں تھا اس لیے وہ جھلاّتا اور لڑتا جھگڑتا تھا۔ وہ بلا کا حسّاس طبیعت تھا۔ وہ کسی بھی سطح اور طبقے کے کردار سے ملاقات کر سکتا تھا اور ملاقات بھی کیسی..... یہ کہئے کہ وہ کردار کی زندگی کی چھان پھٹک کر سکتا تھا اسی لیے اس نے اردو فکشن کو سوگندھی 'ممی' 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' 'مد بھائی'، سراج، منگو کوچوان 'موذیل' خوشیا جیسے لازوال کردار عطا کئے اور ان کردار کے ارد گرد جو کہانیاں اس نے بُنیں وہ عظیم کہانیاں قرار پائیں۔

منٹو نے نہ یہ بتایا کہ جو ہو رہا ہے اچھا یا بُرا، نہ اس نے ظالموں پر لعنت بھیجی نہ مظلوموں پر آنسو بہائے، اس نے تو یہ فیصلہ بھی نہ کیا کہ ظالم برے ہیں اور مظلوم اچھے وہ اس چکر میں بھی نہیں پڑا کہ زندگی کو کیسا ہونا چاہئے۔ وہ سچویشن کو سامنے رکھ کر اپنے کردار اس میں شامل کرتا تھا۔ نہ وہ کسی کو انگلی پکڑ کر چلاتا نہ ان پر اپنے فیصلے صادر کرتا، بس کردار اپنی راہیں طئے کرتے رہتے۔ منٹو اپنے ہم عصر لکھنے والوں سے اسی لیے الگ تھا۔

منٹو نے کہا تھا، افسانے کا پہلا جملہ میں لکھتا ہوں اور باقی افسانہ وہ پہلا جملہ لکھتا ہے، منٹو اپنے کردار کو ایک دریچے کے طور پر استعمال کرتا ہے جس کے ذریعے وہ انسانی معاملات کو دیکھتا اور دکھاتا ہے۔ روشن ضمیر افسانہ نگار منٹو وقت کا قصہ بیان کرر ہا تھا۔ منٹو کی کہانیوں میں کردار ڈرائیونگ سیٹ پر ہوتے ہیں جو طے کرتے ہیں کہ واقعات کس طرح بدلیں گے۔ واقعات طئے نہیں کرتے کہ کردار کا رول کیا ہوگا اور جب تک کردار کا conflict سوسائٹی میں زندہ ہے تب تک اس کی کہانیاں پڑھی جائیں گی جب تک خیر و شر زندگی میں قائم ہیں تب تک منٹو قائم ہے۔ منٹو کا سفر ریل کی پٹری کی طرح نہیں ہے بلکہ وہ ندی کی طرح اپنے راستے خود بناتا چلتا ہے۔

ایک سچویشن دیکھئے: منٹو کو خون کی قے ہوتی ہے، بے ہوشی کے دورے پڑ رہے ہیں لیکن حجام کو بلا کر داڑھی بنا رہے ہیں کہیں زیادہ بال رہ گئے تو جھلا بھی رہے ہیں، ان کے افسانوں میں بھی اس طرح 'زائد بال' نہیں ملتے، وہ اپنے افسانوں میں بھی neatness چاہتے تھے اسی لیے تو داڑھی کے زائد بال پر جھلاتے تھے۔

منٹو نے مہذب سماج سے اپنے افسانوں کے ذریعے کہا کہ پرنالہ کتنا ضروری ہے، گھر کے پچھواڑے کی گندگی بھی تو انسان کی خارج کی ہوتی ہے۔ موت منٹو کے سامنے تھی وہ موت سے تنہائی میں آنکھیں چار کرنا چاہتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ کوئی انہیں مرتا ہوا نہ دیکھ سکے کہ وہ اپنی شکست برداشت نہ کر سکتے تھے۔ وہ اپنی ذلت اور رُسوائی سے بچنے کے لیے فرار اختیار کرتے تھے۔ انا کی آسودگی نہ پا کر وہ میدان سے بھاگ جاتے اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ فراریت پسند تھے......

منٹو اپنے گھر سے بھاگے، امرتسر سے بھاگے، لاہور سے بھاگے، ریڈیو کی ملازمت سے بھاگے، پھر ممبئی سے بھاگے اور آخر میں اس دنیا سے ہی بھاگ لیے۔ یہ ان کی انا کی شکست تھی انہوں نے وہی کیا جو ان کا ضمیر تسلیم کرتا تھا۔ ان کے افسانوں پر مقدمے چلے خاکوں پر اعتراض کیا گیا، لیکن انہوں نے جو لکھا ڈنکے کی چوٹ پر لکھا اور کسی بھی طرح کی تنقید کی پروا نہ کی۔

منٹو کے والد عدالت میں بھی منصف تھے اور گھر میں بھی، منٹو ایک بے چین روح تھا اسی لیے گھر کا پابند ماحول اور والد کی سخت گیر طبیعت ان کے لیے عذابِ جاں بن گئے، محبت شفقت اور ہمدردیوں سے محروم منٹو گھر سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی کمیوں کو دور کرنے کے لیے ہنگامے شروع کیے۔ شرارتیں کیں اور انانیت کا شکار ہوا اپنے آپ کو دوسروں پر حاوی کرنے کی قوّت اس میں پیدا ہوئی تھی۔ یہ قوّت منٹو کی شخصیت کے اسی خلا کو پُر کرتی تھی جس سے وہ شعور سنبھالتے ہی محروم کر دیا گیا تھا۔ والد کا کٹھور پن اس کے افسانوں میں طرح طرح سے جھانکتا ہے۔

دوستوں نے بھی اسے سمجھنے میں غلطیاں کیں، اس نے محبتیں ڈھونڈیں، لیکن ناکام ٹھہرا اور اس کے زخم بغیر مرہم کے ناسور بنتے رہے۔ آخرش اخلاقیات کے روایتی چوکھٹے کو توڑ پھوڑ کر اس نے نئی اخلاقیات کی بنیاد ڈالی۔ اینٹ گارا وہی تھا لیکن اینٹوں کو جوڑنے میں جو میٹیریل لگا وہ منٹو نے تیار کیا تھا۔ دوستوں سے اس نے محبت کی، خلوص کا اظہار کیا لیکن جب اسے محبت کی ضرورت تھی وہ وقت گزر چکا تھا۔اس کا ردِعمل یہ ہوا کہ وہ دوستوں کے خلوص پر اپنا حق سمجھنے لگا۔ افسانوں میں کرداروں کا ڈھیٹ پن 'ضد' مروجہ فریم سے باہر چھلانگ لگانے کا رویہ اسی نفسیات کا ردِعمل ہے۔

منٹو کا آرٹ استعارہ ہے اسی لیے تو اس کی موت کے ساٹھ سال بعد بھی زندہ و تابندہ ہے اور زندہ و پائندہ رہے گا۔ تبدیل ہوتے معاشرتی منظر نامے نے منٹو کے Relevance کو کم کرنے کے بجائے بڑھایا ہے۔ منٹو پر مراٹھی، گجراتی، ہندی اور انگریزی زبانوں میں جو کام کیا جا رہا ہے یہ اس کے استعارہ ہونے کی زندہ مثال ہے۔ غالب کے ہمعصر کئی تھے جو وقت کی دُھند میں کھو گئے۔ غالب نے اپنی Relevancy برقرار رکھی۔

شیکسپیئر کا ایک کردار کہتا ہے "میں آیا، میں نے دیکھا، میں نے فتح کر لیا" منٹو کے بارے میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ "وہ آیا اس نے افسانے لکھے وہ دنیائے ادب پر چھا گیا" وہ بلند سے بلند تر ہوتا گیا، بعد میں وہ اتنا بلند ہوا کہ اس کے مخالفین جب اس کی طرف دیکھتے تو ان کی ٹوپیاں گرنے لگتیں۔ اس کے موافقین کی ایک تھیوری کے مطابق وہ آج بھی وقت کے ساتھ سر بلند ہوتا جا رہا ہے اور مخالفین سلیولیس بلاؤز پہنے بغلیں جھانک رہے ہیں۔

منٹو کے آگے کہانیاں پڑا باندھے کھڑی رہتی تھیں کہ مجھے لکھو مجھے لکھو، اپنے آپ میں یہ ایک کرشمہ ہی ہے۔

ممبئی میں منٹو نے ۱۱رسال گزارے، وہ پاکستان چلا گیا لیکن ممبئی کو یاد کرتا رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جو لمحات اس نے ممبئی میں جئے تھے وہ اس کی زندگی کا سرمایہ تھے وہ

پاکستان جا کر بھی ان ہی لمحات کی جگالی کرتا نظر آتا ہے۔(اس کے خطوط دیکھئے) صحافتی ملازمت اور فلمی مصروفیات، ممبئی نے اسے سہارا ہی نہیں دیا بلکہ جینے کا مطلب بھی عطا کیا۔ یہاں اس نے بے تحاشا شراب پی، یہیں اس کی شادی ہوئی، یہاں وہ پہلی بار باپ بنا یہاں اس نے ہزاروں لاکھوں کمائے اور خرچ بھی کر دئے اور یہی وہ شہر تھا جہاں شادی کے دن اُس کے پاس صرف چار آنے تھے۔

'گنجے فرشتے' کے عنوان سے اس نے جو خاکے لکھے وہ اصل میں ممبئی کی زندگی کو دوبارہ جینے کا ایک تخلیقی بہانہ تھا۔ترقی پسند افسانہ نگاروں کی طرح منٹو کا آرٹ بھی زندگی کی عکاسی اور ترجمانی کرتا ہے۔منٹو کا آرٹ اپنے آس پاس بکھری سچائیوں کو ان کی تمام تر ہولناکیوں اور خباثتوں کے ساتھ قبول کرتا ہے اور اپنی ایک نئی سچائی تخلیق کرتا ہے۔نئی روایت قائم کرتا ہے، نئے اقدار کھڑے کرتا ہے۔

شدّتِ احساس کا مارا منٹو بے چارہ مر گیا، وہ بہت پیتا تھا، بے قاعدہ زندگی بسر کرتا، صحت کا ستیاناس کر لیا تھا، لیکن اس نے ایسا کیوں کیا؟ کسی نے درست کہا ہے" جب معاشرتی حالات کی وجہ سے فن اور زندگی ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوں تو دونوں میں سے ایک کی قربانی دینی ہی پڑتی ہے۔"

منٹو نے تنقید تو کیا اپنے دوست احمد ندیم قاسمی کا مشورہ بھی برداشت نہیں کیا، دوست کے مشورے پر اس نے چھوٹتے ہی کہا" میں نے تمہیں دوست مانا ہے، اپنے ضمیر کی مسجد کا پیش امام نہیں!"........ منٹو نے کہا تھا" طوائف کا وجود ایک جنازہ ہے جسے سماج اپنے کاندھوں پر اُٹھائے ہوئے ہے۔یہ جنازہ جب تک دفن نہیں ہوگا اس کے بارے میں چہ میگوئیاں ہوتی رہیں گی اور میں طوائفوں پر لکھتا رہوں گا۔

منٹو پر اعتراض کیا گیا کہ وہ اپنے افسانوں کے آخر میں تھیلی سے بلّی نکال کر چونکاتے ہیں، منٹو نے کہا" میں بلّی کیا، بلاّ نکال کر بتا سکتا ہوں" دراصل منٹو کو شراب کی طرح افسانہ لکھنے کی لت پڑ گئی تھی۔اس نے بیس سے اوپر کتابیں لکھیں۔پبلشروں کی آمدنی

کا بہتر سامان ہوگیا۔اس کی کتابوں کومنتخب کر کے پچاس بنادیا گیا'منٹو'ہاٹ کیک کی طرح فروخت ہوا(آج بھی ہورہا ہے)لیکن اس کے اہلِ خانہ کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔

'مرزاغالب'منٹو کی کامیاب فلم تھی،لیکن جب ریلیز ہوئی تو منٹوشیام کے مطابق تِلی گلی سے پاکستان جاچکا تھا،اس فلم کا کریڈٹ ثریا اورسہراب مودی کو ملا۔اس فلم سے نہ مرزاغالب کو کچھ ملا نہ منٹو کو کچھ ملا،مرزاغالب کوتو کوئی فرق نہ پڑالیکن منٹو پراس کا بہت اثر ہوا۔منٹو کی نا آسودگی انہیں زندگی بھرتڑپاتی رہی اِسی حالت میں وہ ہنگاموں پر اُتر آئے، جھلاّہٹ بڑھتی گئی،جب راستے مسدود پائے تو ولولے دب گئے اوروہ جذباتی گھٹن کا شکار ہوئے۔یہ گھٹن ان کے ذہنی انتشار میں اضافے کا سبب بنی لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری ،وہ بلا کے حسّاس اورخوددار تھے،وہ روز نئے حوصلے جگاتے اور کنواں کھود نے نکل جاتے اور یوں حالات اورسماج کے کتے بھونکتے رہےاورمنٹو کا ہاتھی جھوم جھوم کر چلتارہا۔

ابھی تین دن پہلے میں ایک بھولے بسرے افسانہ نگار مدھوسدن سے ملا تھا ۸۵رسالہ مدھوسدن ۲۰ سال کی عمر میں غالباً ۱۹۳۴ء میں ممبئ آئے تو منٹو یہیں تھے اور بائیکلہ کے اڈلفی ہاؤس میں رہتے تھے۔مدھوسدن نے مجھے بتایا کہ منٹو سےان کی تین چار ملاقاتیں رہی ہیں اور میں منٹو کی جس بات سے متاثر ہوا وہ یہ تھی کہ کبھی انہوں نے کسی کی برائی نہیں کی کیونکہ جو کچھ برا بھلا کہنا ہوتا وہ منہ پر کہہ دیتے تھے۔...... مدھوسدن نے یہ بھی بتایا کہ منٹو بڑے شاہانہ انداز سے رہتے تھے۔ان کے گھر کا فرش بہترین لکڑی سے بنا تھا جیسا اس زمانے میں امیروں کا ہوا کرتا تھا۔وہ دوستوں کی خوب خاطر مدارات کرتے تھے۔بڑے فراخ دل تھے اور مجھے مشورہ دیتے کہ کتابوں کے مطالعے سے زیادہ زندگی کا مطالعہ کرو،زندگی کے خدوخال کا جائزہ لو،اس کے بعد لکھو،اُن دنوں منٹوفلمستان میں ملازم تھا۔

آج سے آٹھ دس برس پہلے جب اداکار اشوک کمار زندہ تھے،منٹو کی برسی پر میں اسلم پرویز کے ساتھ اشوک کمار سے ملنے ان کے گھر چمبور گیا تھا۔اس وقت

اشوک کمار ۹۲ ربرس کے تھے اور بیمار چل رہے تھے۔ بار بار دمہ کا دورہ پڑتا اور مسلسل کھانستے رہتے، انہوں نے بتایا منٹو میرا اچھا دوست تھا، آج زندہ ہوتا تو وہ ۹۱ ربرس کا ہوتا۔ وہ بڑی اچھی اردو بولتا تھا وہ اُجلا لباس پہنتا اسے داغ دھبّہ بالکل پسند نہ تھا، نہ کپڑوں پر نہ کردار پر!...... منٹو نے میرے بارے میں لکھا تھا اور مجھے پڑھ کر سنایا تھا، میں خوب ہنسا تھا، منٹو بہت اچھا لکھتا تھا، ہم نے اشوک کمار سے پوچھا کہ فسادات کے دنوں میں آپ مسلم محلّے سے کار میں گزرے تھے وہ کیا قصّہ تھا۔ تو اشوک کمار نے مسکرا کر بتایا۔ ''ارے وہ منٹو ڈر رہا تھا، میں کار ڈرائیو کر رہا تھا، وہاں جمع لوگوں نے مجھے دیکھ لیا اور چلاّنے لگے'' اشوک کمار! اشوک کمار! اتنے میں ایک شخص ہمارے پاس آیا اور بولا'' اشوک صاحب ادھر باجو کی گلی سے نکل جایئے'' جب میں اپنی کار لے کر باجو کی گلی سے نکلا تو منٹو نے راحت کی سانس لی! ...... منٹو کو یاد کرتے ہوئے اشوک کمار نے یہ بھی بتایا تھا کہ'' میں منٹو کے گھر اپنی بیوی کے ساتھ کئی بار گیا، وہ بڑے دل کا آدمی تھا۔ دوستوں پر پیار لُٹاتا تھا۔ مسلم کھانے پکوا کر ہمیں کھلاتا تھا۔ میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی کہ اس کا ممبئی میں اچھا چل رہا تھا پتہ اُسے نہیں کیا سوجھی کہ پاکستان چلا گیا، بہت دنوں بعد اس کا خط آیا تھا کہ میں ممبئی آنا چاہتا ہوں۔........

منٹو نے عظیم کہانیاں لکھیں اس کی زندگی بھی ایک عظیم کہانی تھی۔ منٹو کی کہانی کا سب سے عظیم کردار اس کی بیوی صفیہ ہے جس پر پاکستان میں منٹو نے فلمی کہانی 'ایک گناہ اور سہی' تحریر کی۔ صفیہ لکھتی ہیں'' میں خوش قسمت ہوں کہ ایک بڑے ادیب کے ساتھ زندگی گزاری۔ منٹو کی چھوٹی بچی ٹائفائیڈ کے بخار میں تپ رہی ہے صفیہ اُدھار پیسے لاکر منٹو کو دوا کے لیے باہر بھیجتی ہیں لیکن منٹو دوا کے بدلے شراب لے آتے ہیں۔ اور پھر صفیہ لکھتی ہیں'' اللہ کے فضل سے بہت اچھی گزر رہی ہے۔ منٹو کو مجھ سے، بچیوں سے بہت محبت تھی۔ منٹو کی جیب میں صرف ساڑھے چار آنے وہ اپنی بہن کو ٹیلی فون پر بتاتے ہیں، عجب مخمصے میں گرفتار ہوں برات آنے والی ہے، میں کیا کروں۔ اتنا ہی

کر سکتا ہوں کہ چار آنے کی سگریٹ کی ڈِبیا خرید لوں اور آٹھ آنے کی ماچس.... ''اور پھر منٹو کہتا ہے ''میرے بعد میری بیوی اور بچوں کا کیا ہوگا۔

لیکن وہ ذمہ دار شوہر بھی ہے اور شفیق باپ بھی اور یاروں کا یار بھی.... ماں پوچھتی ہے '' بیٹے سعادت! تم زیادہ کیوں نہیں کماتے!'' پھر ماں پوچھتی ہے سعادت شادی کرو گے؟ کہنے کو تو منٹو ہاں کر دیتا ہے لیکن پھر پچھتا تا ہے کہ بیوی کا خرچ کیسے پورا ہوگا، اس لیے تو وہ بیوی کے والد یعنی اپنے سسر سے اپنے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتا دیتا ہے کہ وہ شراب پیتا ہے اسے کئی کئی ماہ تک تنخواہ نہیں ملتی۔ وہ گندی کھولی میں رہتا ہے، لیکن صفیہ کے والد منٹو کے لہجے کو اس کی خوبیوں کی طرح قبول کرتے ہیں۔

منٹو بستر مرگ پر ہے اور کہتا ہے میرے کوٹ کی جیب میں ساڑھے تین آنے ہیں اس میں کچھ پیسے ملاؤ اور وھسکی لے آؤ۔ وھسکی آتی ہے اور وھسکی کا ایک گھونٹ پی کر منٹو مر جاتا ہے۔ جب وہ اس دنیا سے چلا گیا تو ہوسکتا ہے اس سے پوچھا گیا ہو ''بول جنت یا جہنم؟'' اور منٹو نے کہا ہو

''وھسکی!''

☆☆☆

ڈاکٹر سید منیر محی الدین قادری

منٹو کی خاکہ نگاری کا ایک تجزیاتی مطالعہ

انشائیہ، افسانہ، ڈراما اور ناول کی طرح خاکہ(Sketch) بھی ادب کی ایک جداگانہ صنف ہے۔ خاکے چاہے شخصی ہوں یا خیالی فنی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے اگر چہ ان میں تفریق کی گئی ہے حالانکہ فن کے اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ ایک ہی کہلاتے ہیں۔ایک اچھے 'خاکہ' کی خوبی یہ ہے کہ اُس میں مصنف کی شخصیت چھپی رہے اور موضوع کی شخصیت زیادہ اُبھر کر سامنے آئے۔

'خاکہ نگاری' اردو ادب کی ایک مقبول صنف ہے۔اس کے لیے کوئی موضوع کی تخصیص نہیں، لیکن خاکے زیادہ تر ایسی شخصیتوں پر لکھے جاتے ہیں جنہوں نے فنونِ لطیفہ، ادیب اور شاعر یا پھر کسی نے شعبۂ حیات میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہوں۔ خاکہ میں شخصیتوں کی تصویریں براہِ راست اس طرح کھینچی جاتی ہیں کہ اُن کا ظاہر و باطن پوری طرح اُبھر کر سامنے آجائے۔ شخصیتوں کے خاکوں میں زندگی کے حقیقی واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے اُن میں سے چند ایسے واقعات کا انتخاب کرنا ہوتا ہے جو موضوع کی سیرت کو پوری طرح بے نقاب کرسکیں۔خاکہ کا موضوع کوئی حقیقی شخصیت بھی ہوسکتی ہے یا خیالی بھی۔ حقیقی خاکہ میں خاکہ نگار جو کچھ دیکھتا ہے اُس کو بالکل اُسی طرح بیان کردیتا ہے جیسا کہ وہ دیکھتا ہے۔" خیالی خاکہ" میں خاکہ نگار تخیل سے مدد لیتا ہے اور حقیقت کا پیرہن اِس خوبی سے پہناتا ہے کہ حقیقی اور خیالی میں تمیز کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔

خاکے مختلف قسم کے ہوا کرتے ہیں جیسے تعارفی خاکے، سرسری خاکے، تاثراتی خاکے، مدحیہ اور توصیفی خاکے، بیانیہ اور سنجیدہ خاکے، کرداری خاکے، سوانحی خاکے، معلوماتی خاکے، اجتماعی خاکے، مزاحیہ اور طنزیہ خاکے وغیرہ۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اردو ادب میں جو نئے رُجحانات ملتے ہیں اُس کا بڑا دخل ترقی پسند تحریک کا ہے جس نے ادب کے دھارے کو ایک خاص رُخ کی طرف موڑنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بالراست اثرات خاکہ نگاروں پر بھی ہونے لگے۔ اس طرح کے خاکوں کا آغاز ۱۹۴۸ء میں ہوا۔ زبان کی لطافت اور اسلوب کی دلکشی کے اعتبار سے اگر ہم جائزہ لیں تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو کے خاکوں میں یہ تمام خوبیاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ اس طرح کی مثالیں ہمیں سردار جعفری، عصمت چغتائی اور ساحرلدھیانوی کے خاکوں میں ملتی ہیں۔

کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو کے خاکوں کا اگر تقابلی مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ منٹو کے خاکوں کی زبان با محاورہ اور لطافت و سلاست کا ایک دلکش اسلوب دکھائی دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے ہم عصر خاکہ نگار کرشن چندر سے کہیں آگے نکل جاتے ہیں۔ اِس بات کا ثبوت ہمیں منٹو کے مجموعۂ خاکوں میں مل جاتا ہے' کلیاتِ منٹو' کے نام سے ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے ۲۰۰۷ء میں منٹو کے خاکوں کو شائع کیا ہے جس میں 'گنجے فرشتے' اور 'لاؤڈ اسپیکر' وغیرہ میں موجود خاکوں کو یکجا کر کے ترتیب وار پیش کیا گیا ہے۔ جس کے مطالعہ سے منٹو کی فنی حلاحیتوں کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ منٹو کا فنی کمال بامِ عروج پر اُس وقت پہنچ جاتا ہے جب وہ 'لاشعور' کے نفسیاتی پس منظر میں لفظ میں چھپے معنوی گیرائی و گہرائی کی ایک ایسی اکائی کو پیش کرتا ہے جہاں تک ایک عام فنکار کی رسائی ناممکن ہی نظر آتی ہے۔ اِس بات کا بخوبی اندازہ اُن کے خاکوں، افسانوں اور مزاح پاروں میں کیا جا سکتا ہے۔ بالخصوص اُن کے خاکے اپنے موضوعاتی پس منظر میں اس طرح حقائق کی پردہ کشائی کرتے ہیں کہ قاری اِن کے ساحرانہ طرزِ تحریر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ تحقیقی نطقۂ نظر سے دیکھا جائے تو منٹو کا اردو ادب میں داخلہ بحثیت ترجمہ نگار کے ہوا۔ بعد میں انہوں نے بے شمار افسانے، ڈرامے، مزاح پارے، کہانیاں اور خاکے لکھ کر اردو ادب میں اپنا لوہا منوالیا ہے۔ ان تمام اصناف کا بیک وقت جمع ہونا اُن کے کمال فن کا نتیجہ دکھائی دیتا ہے۔ منٹو کا فن جس طرح اُن کے افسانوں اور خاکوں

میں نکھرتا ہوا نظر آتا ہے شاید ہی اُن کے ڈراموں انشائیوں میں دیکھنے کو ملے۔ مزاجاً وہ افسانوی ادب کے خالق نظر آتے ہیں لیکن اُن کے سلجھے ہوئے ذوق کا عکس اُن کے خاکوں میں پوری طرح جلوہ سامانیاں لیے قاری کے دل کو چھونے لگتا ہے۔ اپنے دور کے یہ واحد افسانہ نگار ہیں جنہوں نے اس فن کو بام عروج پر پہنچا دیا، جس کی زندہ مثال اُن کے کثیر التعداد ۲۲۷ رافسانے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ۲۴ رخاکے، ۵۶ رڈرامے، ۶۲ رمزاح پارے اور کئی خطوط کے مجموعے لکھ کر دنیائے ادب میں اپنی انفرادی شناخت بنالی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں خود اُن پر لکھی گئی ۲۴ رتصانیف اور تقریباً اُن کے ۲۹ رافسانے پنجابی، گجراتی اور انگریزی زبانوں میں ترجمہ ہو کر منظر عام پر آئے ہیں جس سے اُن کے ادبی اقدار کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان پر چار تحقیقی مقالے بھی لکھے جا چکے ہیں اور منٹو صدی کے عنوان سے بے شمار سیمینار منعقد ہو چکے ہیں، ہو رہے ہیں اور مستقبل میں بھی ہونے کی اُمید کی جا سکتی ہے۔

منٹو کی تخلیقات کا بظاہر مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ منٹو کی فطری لاشعوری اُن کی تخلیقات کے لفظوں میں اِس طرح پیوست ہوتی ہے کہ ذرا سی جنبش سے اُس میں ایک ایسا ارتعاش پیدا ہونے لگتا ہے کہ جس میں خود مصنف کے بجائے بیان کردہ شخصیت کے باطنی اسرار و رموز قاری کے سامنے کھلنے لگتے ہیں۔ شاید ہی اردو ادب میں اِس طرح کا فنکار ہمیں دیکھنے کو ملے۔ منٹو کی فنی خوبی یہ ہے کہ ان کے لفظوں میں جو معنویت پائی جاتی ہے وہ تہہ داری دکھائی دیتی ہے۔ جس طرح ایک تہہ کھلنے کے بعد دوسری تہہ کھلنے لگتی ہے۔ اُسی طرح اُس کی معنویت مختلف رنگ اختیار کرنے لگتی ہے۔ یوں کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جس قدر اُس کی تہوں میں جانے لگیں گے اُس میں مختلف معانی نکلتے رہیں گے۔ قاری اُس کی تہوں میں اپنے آپ کو اِس طرح گم کرنے لگتا ہے کہ اُس کا سارا وجود اُسی میں غرق ہونے لگتا ہے۔ راقم الحروف منٹو کے خاکوں کی معنویت میں اِس طرح مستغرق ہوا کہ اُس کی گہرائی و گیرائی میں پہنچ کر ایک عجیب و غریب سی ادبی چاشنی کو محسوس کرنے لگا ہے۔ شاید کہ منٹو کے دیگر قارئین کا بھی یہی حال ہوا ہوگا۔

خاکہ نگاری اگر چہ مشکل فن ہے کیونکہ خاکہ نگار پر بہت بڑی ذمہ داری یہ عائد ہوتی ہے کہ کسی بھی شخص پر خاکہ لکھنے سے پہلے اُسے یہ دیکھنا ہوگا کہ رفاقتوں اور رقابتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے خاکوں میں توازن واعتدال کو برقرار رکھے تاکہ خاکہ میں اعتدال کی خوبی پیدا ہونے لگے۔ بلا مبالغہ اِس بات کو ہم منٹو کے خاکوں میں دیکھ سکتے ہیں۔ وہ کسی بھی شخصیت کی خامیوں اور خوبیوں کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ شخصیت پوری طرح کھل کر قاری کے سامنے آجاتی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ زندہ شخص کی طرح حقیقی روپ لیے حرکت کرنے لگتی ہے۔ اِس کی بہترین مثال قائداعظم محمد علی جناح کی شخصیت ہے جس کو منٹو نے ''میرا صاحب'' کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ اِس خاکہ میں انہوں نے قائداعظم کے کمزور بدن میں چھپی طاقتور اور عظیم شخصیت کا پتہ لگا کر خاکہ نگاری کے فن میں ایک ایسا تجربہ کیا ہے کہ ''انسان میں چھپے حقیقی انسان کو لا باہر کیا ہے۔'' یہ واقعی اُن کی فنی عظمتوں کا نتیجہ ہی دکھائی دیتا ہے۔ راقم کے خیال میں وہ ایک ماہرِ نفس ہی نہیں بلکہ وہ نفسیاتی کیفیتوں اور جذباتِ حقیقی کے وہ ایک ایسے نباض بھی ہیں جس کی وجہ سے اُن کے سامنے ہر کوئی شخصیت بالکل آئینہ کی طرح کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ نہ صرف اس کا ظاہری پہلو دکھائی دیتا ہے بلکہ باطنی اسرار و رموز کا ایک مکمل شخص بھی عریاں ہونے لگتا ہے۔ حسب ذیل اقتباس سے اُن کی تحریرانہ سحر انگیزی کا بخوبی پتہ چلتا ہے:

''لیکن جب میں نے جلوس کے مختلف موڑوں اور پیچوں میں اُن کو کئی مرتبہ دیکھا تو میری تنومندی کو دھکا سا لگا۔ میرا قائد اور اِس قدر دُبلا، اِس قدر نحیف!

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

وہ ہمارے گھر آتے تھے۔ یہ اُن کی مہربانی اور خدا کی قدرت تھی۔ خدا کی قسم میں کبھی اُن کو دیکھتا تھا۔ اُن کے نحیف و نزاد جسم کو اور کبھی اپنے ہٹے کٹے ڈیل ڈول کو، جی میں آتا کہ میں سکڑ جاؤں یا وہ پھیل جائیں۔ لیکن دل ہی دل میں اُن کے اُن ہی ناتواں دست و بازو کو نظرِ بد

سے محفوظ رکھنے کے لیے دعائیں بھی مانگیں۔ دشمنوں پر اُن کے لگائے ہوئے زخموں کا چرچا عام ہوا۔" (کلیاتِ منٹو صفحہ ۳۳۶)

منٹو نے اِس خاکہ میں محمد علی جناح کی مکمل شخصیت کا نقشہ کھینچا ہے۔ اُن کی گھریلو زندگی ہو یا اُن کے نجی معاملات، ملازموں کے ساتھ حسنِ سلوک کا برتاؤ، اپنے جسم کے کمزور وناتواں ہونے کے باوجود ملازموں کو تنومند اور طاقتور بنانے کا انہوں نے غذائی انتظام بھی کیا تھا۔ ان تمام تفصیلات کے باوجود محمد علی جناح اپنی بیوی اور نافرمان لڑکی کی جدائی سے کس قدر متاثر ہوئے منٹو نے' آزاد' کی زبانی اُس صورتِ حال کا نقشہ اِس طرح کھینچا ہے:

" آزاد نے جواب دیا، ملازموں سے کیا بات چھپی رہتی ہے کبھی کبھی وہ صندوق کھلوانے کا حکم دیتے تھے۔ جست کے اِس جہازی صندوق میں بے شمار کپڑے تھے۔ ان کی مرحوم بیوی اور نافرمان بیٹی کے جب وہ چھوٹی سی بچّی تھی، یہ کپڑے باہر نکالے جاتے تو صاحب بڑی سنگینی خاموشی سے اُن کو دیکھتے رہتے۔ ایک دم اُن کے دُبلے پتلے اور شفاف چہرہ پر غم واندوہ کی لکیروں کا ایک جال سا بکھر جاتا۔ 'اِٹ اِز آل رائٹ، اِٹ اِز آل رائٹ' کہہ کر وہ اپنی آنکھوں سے مونوکل اُتارتے اور اُسے پونچھتے ہوئے ایک طرف چل دیتے۔" (کلیاتِ منٹو صفحہ ۳۴۶)

مذکورہ خاکہ میں منٹو نے محمد علی جناح کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا مختلف زاویوں سے جائزہ لیا ہے۔ یہ خاکہ طویل ہونے کے باوجود کافی دلچسپ دکھائی دیتا ہے۔

"عصمت چغتائی" پر منٹو کا خاکہ عصمت کی پوری شخصیت کا احاطہ کیے ہوئے نظر آتا ہے۔ جس میں منٹو نے ایک ذمہ دار خاکہ نگار کی حیثیت سے بہت ہی اعتدال کے ساتھ عصمت کی خامیوں اور خوبیوں دونوں پہلوؤں کا بڑے ہی فنکارانہ زاویۂ نظر سے جائزہ لیا ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے دوست تھے اور افسانہ نگار بھی۔ اِن دونوں میں اتنی قربت تھی کہ عوام و خواص میں غالب گمان ہونے لگا کہ شاید دونوں ازدواجی زندگی میں بندھے جانے والے ہیں۔ اِس بات کی وضاحت خود انہوں نے حیدرآباد کے حوالہ سے بڑے دلچسپ انداز میں کی ہے ان کے لفظوں میں طنز ومزاح کے نشتر اس طرح نکلتے ہیں کہ روکنے کا نام ہی نہیں لیتے۔

منٹو نے ''عصمت چغتائی'' خاکہ میں عصمت کی افسانہ نگاری میں موجود فنی تکنیک اور اُپج کا نہایت گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے، جس سے عصمت کے مزاج اور اُن کے اسلوبِ بیان کی انفرادیت کا پتہ چلتا ہے۔ منٹو کی مرقع کشی میں عصمت کی شخصیت کے وہ تمام پہلو روشن ہونے لگتے ہیں جن سے اُن کی شخصیت خوب نکھر کر قاری کے سامنے آنے لگتی ہے۔ عصمت کے فطری تقاضوں اور مزاج کے نرالے پن کا اظہار منٹو نے اِس طرح کیا ہے:

''عصمت کو برف کھانے کا بہت شوق تھا۔ بالکل بچّوں کی طرح ڈلی ہاتھ میں لیے دانتوں سے کٹا کٹ کاٹتی رہتی ہے۔ اُس نے اپنے بعض افسانے بھی برف کھا کھا کر لکھے ہیں۔ چار پائی پر کہنیوں کے بل اوندھی لیٹی ہے، سامنے تکیہ پر کاپی کھلی ہے۔ ایک ہاتھ میں فاؤنٹین پین ہے اور دوسرے ہاتھ میں برف کی ڈلی، ریڈیو اونچے سُروں میں چلاّ رہا ہے مگر اُس کا قلم اور منہ دونوں کھٹا کھٹ چل رہے ہیں۔''

منٹو نے عصمت کا سراپا اِس طرح کھینچا ہے:

''عصمت کی شکل وصورت دلفریب نہیں لیکن دلنشیں ضرور ہے، اُس سے پہلی ملاقات کے نقش ابھی تک میرے دل ودماغ میں محفوظ ہیں۔ بہت ہی سادہ لباس میں تھی۔ چھوٹی کنی کی سفید ساڑی، سفید زمین کا کالی کھڑی لکیروں والا چُست بلاوز، ہاتھ میں چھوٹا سا پرس، پاؤں میں بغیر ایڑی کا براؤن چپل، چھوٹی چھوٹی مگر تیز متجسّس آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں والی عینک چھوٹے مگر گھنگریالے بال، ٹیڑھی مانگ، ذرا مسکرانے پر بھی گالوں میں گڈھے پڑ پڑ جاتے تھے۔'' (کلیاتِ منٹو صفحہ ۲۸۸)

منٹو نے 'پری چہرہ نسیم بانو' کے خاکہ میں ایک اداکارہ کے ظاہری و باطنی دونوں پہلوؤں کا اِس طرح مطالعہ کیا کہ گویا وہ ایک کھُلی کتاب ہے جس کا ہر ایک ورق اپنے متن کو اِس طرح واضح کرتا نظر آتا ہے کہ اُس کے معانی ومطالب بآسانی سمجھ میں آجائیں۔

پری چہرہ نسیم بانو کے میک اپ (Make-up) بھرے چہرے کے پیچھے اُس کی سادہ مزاجی کی حقیقی خوبی اُس کی مصنوعی خوبصورتی پر اِس طرح غالب آگئی ہے کہ مصنوعی چہرہ محض

ایک دکھاوا ہی دکھائی دینے لگتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ ایک خدا ترس عورت تھی جو اپنی پوری زندگی نہایت سادگی کے ساتھ گزارتی چلی آئی تھی۔ حسبِ ذیل اقتباس سے مذکورہ حقائق پر روشنی پڑتی ہے۔ منٹو اور اُن کی بیوی صفیہ نسیم کے ہاں ایک رات مہمان ہوئے۔ نسیم سونے سے پہلے اپنا میک اپ اُتارنے کے بعد وہ کس طرح عبادتِ خدا میں مصروف رہتی تھی اِس بات کو صفیہ کی زبانی منٹو لکھتے ہیں:

''میک اَپ اُتارنے کے بعد اُس نے چہرہ پر مختلف روغن مَلے اور ہاتھ دھو کر قرآن اُٹھایا اور تلاوت شروع کر دی۔ میری بیوی بے حد متاثر ہوئی بے اختیار اُس کے منہ سے نکلا۔ نسیم..... قسم سے تم تو ہم لوگوں سے کہیں اچھی ہو.....! اِس احساس سے کہ یہ بات اُس نے ڈھنگ سے نہیں کہی۔ صفیہ ایک دم خاموش ہوگئی۔ قرآن تلاوت کرنے کے بعد نسیم سوگئی۔ پری چہرہ نسیم 'پکار' کی نور جہاں۔ ملکۂ حُسن۔ احسان کی روشنی۔ چھمبا کی بیٹی اور دو بچوں کی ماں!(کلیاتِ منٹو صفحہ ۱۸۵)

منٹو نے اداکارہ 'نرگس' کا جو خاکہ لکھا ہے اُس میں اُس کے عادات و اطوار اور مزاج کے فطری تقاضوں کو طنزیہ پیرائے میں بڑے دلکش انداز کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''طبیعت میں نہایت ہی معصوم اور کھلنڈرا پن تھا بار بار اپنی ناک پونچھتی تھی جیسے ازلی زکام کی شکار ہے۔ 'برسات' میں اس کو اداکارہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مگر اس کے اُداس اُداس چہرے سے صاف عیاں تھا کہ اس کے اندر کردار نگاری کا جوہر موجود ہے۔ ہونٹوں کو کسی قدر بھینچ کر بات کرنے اور مسکرانے میں گو یا بظاہر ایک بناوٹ تھی مگر صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ بناوٹ سنگار کا روپ اختیار کر کے ہی رہے گی۔ آخر کردار نگاری کی بنیادیں بناوٹ ہی پر استوار ہوتی ہیں۔''

منٹو نے اپنے خاکے میں فلسفیانہ اور حکیمانہ باتوں کا اِس خوبصورتی کے ساتھ احاطہ کیا ہے کہ بات میں بات پیدا کر کے حقائق کی پردہ کشائی کرنا اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل

ہے۔ وہ فن میں اِس طرح ڈوب جاتے ہیں کہ فن کے اندر فن نکالنے کا بھی وہ گُر جانتے ہیں، جس کی وجہ سے اُن کے خاکے قاری کو نہ صرف نئی معلومات فراہم کرتے ہیں بلکہ لذت کے تسلسل کو بھی برقرار رکھتے نظر آتے ہیں۔ اِس طرح منٹو کے خاکے بہت ہی جاندار ہوتے ہیں۔ منٹو کا فنی کمال یہ ہے کہ تشبیہہ واستعاروں کی زبان میں اپنی بات کو بڑے ہی مؤثر پیرائے میں بیان کرنے کا ہنر بھی رکھتے ہیں جس کی وجہ سے اُن کے خاکے ادبِ عالیہ کے زمرے میں شامل ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ اِس ضمن میں اُن کا خاکہ 'تین گولے' اُس کی ایک بہترین مثال ہے۔ منٹو نے اِس خاکہ میں 'تین گولے' کو بنیاد بنا کر اپنی بات کو مختلف مثالوں کے ذریعے سمجھایا ہے۔ جب کہ انھوں نے حسن وعشق اور موت کو تین گولے سے تشبیہہ دی ہے۔ اتنا ہی نہیں انھوں نے 'تین گولے' کو دیگر مثالوں کے ذریعے اِس طرح سمجھایا ہے کہ انسانی عقل حیران وششدر رہ جاتی ہے۔ اِس ضمن میں ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''خدا، بیٹا اور روح القدس عیسائیت کے اقانیم، تریشول، مہادیو کا سہ شاخہ بھالا۔ تین دیوتا، برہما، وشنو، ترلوک، آسمان زمین اور پاتال، خشکی، تری اور ہوا، تین بنیادی رنگ سُرخ، نیلا اور زرد، پھر ہمارے رسوم اور مذہبی احکام یہ تیجے، سوئم اور تلینڈیاں، وضو میں تین مرتبہ ہاتھ منہ دھونے کی شرط، تین طلاقیں اور سہ گونہ معانقے، اور جُوے میں نرد بازی کے تین پانسوں کے تین نقطے یعنی تین کانے، موسیقی کے لیے سنے، حیاتِ انسانی کے ملبے کو اگر کھود کر دیکھا جائے تو میرا خیال ہے ایسی کئی تثلیثیں مل جائیں گی، اس لیے کہ توالد وتناسل کے افعال کا محور بھی اعضائے ثلاثہ ہے۔'' (کلیاتِ منٹو، صفحہ ۱۹۹)

منٹو کے خاکوں میں ہمیں مختلف موضوعات کی شکل میں مختلف فلمی شخصیتوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ انھوں نے 'بابوراؤ پٹیل' اور 'باری صاحب' خاکہ میں اُن دونوں کی بزدلی کا اظہار بڑے ہی بے باکانہ انداز میں کیا ہے تو کہیں اداکار 'اشوک کمار' کی جنسی کمزوریوں کا ذکر بھی کیا ہے تو کہیں 'آغا حشر کاشمیری' خاکہ میں اُن کی شبیہہ اور لباس کا ذکر بڑے ہی دلکش پیرائے میں کرتے ہیں تو کہیں 'اختر شیرانی' خاکہ میں شاعری کی امتیازی خصوصیات کو بیان کیا ہے جس

میں اُن کی خیالی محبوبہ بن سنور کر سامنے آتی ہے۔ اس طرح اُن کے بہت سے خاکے تفصیل طلب ہیں لیکن طوالت کے خوف سے راقم نے یہاں صرف آخر میں منٹو کی شخصیت میں موجود اُن کے مذہبی عقیدت و محبت اور خوفِ خدا کا ذکر کرنے کو مناسب سمجھا ہے۔ بقول منٹو کہ وہ ایک ''کڑوے شربت نوشی کے عادی'' ہونے کے باوجود اُن کے اندر جو سیدھا سادہ، معصوم انسان چھپا ہوا ہے، اُس کا اظہار وہ بڑے خوش اسلوبی کے ساتھ کرتے ہیں۔ 'اشوک کمار' خاکہ کا ایک واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں جس کے ذریعہ منٹو کے خوفِ خدا کا ایک واضح تصور قاری کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ اُس وقت کا واقعہ ہے جب ممبئی میں ہندو مسلم فسادات پورے عروج پر تھے۔ ایسے موقع پر رات دیر گئے اشوک کمار منٹو کو اُس کے گھر چھوڑنے اپنی کار میں لے جا رہا ہے تو اُس وقت منٹو پر جو کیفیت طاری تھی خود منٹو کی زبانی سنئے:۔

''شارٹ کٹ کی خاطر وہ موٹر کو ایک خالص اسلامی محلے میں لے گیا۔۔۔۔۔۔ سامنے ایک برات آرہی تھی جب میں نے بینڈ کی آواز سنی تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ ایک دم اشوک کا ہاتھ پکڑ کر میں چلّایا ''دادا مُنی، یہ تم کدھر آنکلے۔''

''اشوک میرا مطلب سمجھ گیا۔ مسکرا کر اُس نے کہا ''کوئی فکر نہ کرو'' میں کیونکر فکر نہ کرتا۔ موٹر ایسے اسلامی محلّے میں تھی جہاں کسی ہندو کا گزر ہی نہیں ہوسکتا تھا اور اشوک کو کون نہیں پہچانتا تھا۔ کون نہیں جانتا تھا کہ وہ ہندو ہے۔ ایک بہت بڑا ہندو جس کا قتل معرکہ خیز ہوتا۔ مجھے عربی زبان میں کوئی دعا یاد نہیں تھی۔ قرآن کی کوئی موزوں و مناسب آیت بھی نہیں آتی تھی۔ دل ہی دل میں، میں اپنے اوپر لعنتیں بھیج رہا تھا اور دھڑ کتے ہوئے دل سے اپنی زبان میں بے جوڑ سی دعا مانگ رہا تھا کہ اے خدا مجھے سُرخ رُو رکھیو۔۔۔۔۔۔ ایسا نہ ہو کوئی مسلمان اشوک کمار کو مار دے۔ اور میں ساری عمر ان کا خون اپنی گردن پر محسوس کرتا رہوں۔ یہ گردن قوم کی نہیں میری اپنی گردن ہے مگر یہ ایسی ذلیل حرکت کے لیے دوسری قوم کے سامنے ندامت کی وجہ سے جھکنا نہیں چاہتی۔'' (کلیاتِ منٹو، صفحہ:۹۹)

اِس کے علاوہ منٹو 'پارو دیوی' خاکہ میں بھی وہ اپنے مذہب اسلام سے کس قدر محبت

رکھتے ہیں اور سچے دل کے ساتھ ادب و احترام کرتے ہیں اِس بات کا اندازہ حسبِ ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

''ٹھمریاں، غزلیں، گیت بہت دیر تک ہوتے رہے۔ آخر میں جب اُس نے بھجن سنایا تو اُس نے میری موجودگی کا احساس کر کے ایک نعت شروع کی، لیکن میں نے فوراً اُسے روک دیا، پارو دیوی! یہ محفل نشاط ہے۔ شراب کے دور چل رہے ہیں یہاں کالی کملی والے کا ذکر نہ کیا جائے تو اچھا ہے۔'' (کلیاتِ منٹو،ص:۱۵۰)

آخر میں عرض کرتا چلوں کہ منٹو کے چاہے افسانے ہوں یا خاکے ہر ایک میں انہوں نے تلخ حقائق کو بیان کر کے سماج میں بدنامی تو حاصل کی لیکن اُس کے پس پردہ اردو ادب میں وہ بلند مقام حاصل کیا جو آپ کے ہم عصر افسانہ نگار و ادیب حاصل نہ کر سکے۔ بعض ناقدین نے اُن پر فحش نگار کی مُہر تو لگا دی لیکن اُس فحش نگار کے اندر بھی ایک جیتا جاگتا سچا مسلمان اپنے ایمان و یقین کی دولت لیے اپنے بعض مکروہ اعمال پر خود کو کوس رہا تھا، اس کے باوجود اُن کے اندر ایمان و یقین کا چراغ پورے اعتماد کے ساتھ سماج کی طوفانی تیز ہواؤں سے اپنے آپ کو اس طرح محفوظ رکھا ہے کہ وہ بجھنے نہ پائے۔

منٹو کے خاکے پڑھنے کے بعد یہ طے کرنا بالکل آسان ہو جاتا ہے کہ وہ پہلے ایک سچے مسلمان ہیں اور بعد میں ایک ادیب۔ وہ بھی ذریعہ معاش کی وجہ سے بالکل اُسی طرح مجبور محض ہیں جس طرح ہندوستانی طوائف مجبورِ محض ہے، لیکن اُن کے قلم میں توازن و اعتدال اس طرح برقرار ہے کہ ذرا سی جنبش سے بھی وہ اپنے خدا پر اپنے مذہب پر اپنے تیقّن اس طرح برقرار ہیں جس طرح ایک مضبوط پہاڑ زمین کے سینے پر کیل ٹھونکے ہوئے ہے۔

ڈاکٹر ظہیر محمد

سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری

قصے کہانیاں اور داستان گوئی کا رواج زمانہ قدیم سے رہا ہے۔ بڑے بڑے راجاؤں اور نوابوں کے یہاں اچھے داستان گو رکھے جاتے تھے جن کی تنخواہیں دربار سے ملا کرتی تھیں۔ یہ قصے، کہانیاں اور داستان دو روزہ اور سہ روزہ تک سنے سنائے جاتے تھے۔ بعض اتنے بڑے ہوتے تھے کہ اُن کو ختم ہونے میں ہفتوں لگ جاتے تھے، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ زمانے نے کروٹ بدلی اور ان کی جگہ ناول، افسانہ ڈرامہ اور رپورتاژ وغیرہ نے جنم لیا۔

اردو میں افسانہ نگاری کی باقاعدہ داغ بیل انگریزی افسانوں کے ترجمے سے پڑی۔ یہ ترجمے ''اودھ پنچ'' میں شائع ہوئے جو بڑی دلچسپی سے پڑھے گئے۔ پھر تو فضا میں افسانے ہی افسانے بکھر گئے۔ اب یہ حال ہے کہ کوئی گھر ایسا نہ ہوگا جہاں افسانوں کا مجموعہ نہ ہو۔ اردو کے اُبھرتے ادیبوں نے اس فن کو گلے لگایا اور طبع زاد افسانے لکھے جانے لگے، ان افسانوں میں بنیادی خاصیت وہی ہے جو ناول کی ہے۔

افسانہ اردو نثر کی جدید ترین شکل ہے جس میں افسانہ نگار اپنے تخیل اور قوتِ مشاہدہ سے حیات انسان کی منجملہ حرکات وسکنات کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتا ہے۔ کردار نگاری میں وہ حرکات وسکنات افعال واشکال کی ایک ساتھ ترجمانی کرتا ہے۔ ناول میں جس قدر طوالت اور وضاحت سے کام لیا جاتا ہے اس میں انسانی زندگی کے کسی خاص پہلو پر روشنی ڈال کر مقصد پیش کیا جاتا ہے۔ مثلاً اخلاق وایثار، حسن وعشق، خودداری اور رواداری کے جذبہ کو اس میں پیش کیا جائے۔ افسانہ نگار کو طرز بیان مختصر پُر لطف ڈھنگ سے پیش کرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ نگار کو سادگی، روانی، شگفتگی اور نفسیات انسانی کا پورا خیال کرنا پڑتا ہے۔

ابھی تک ہم افسانے کے آغاز وارتقا اس کی مقبولیت کے اسباب پر روشنی ڈال رہے

تھے آیئے دیکھیں کہ کن خصوصیات کی بنا پر منٹو افسانوی ادب میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔سعادت حسن منٹو امرتسر کے کشمیری ''منٹو'' خاندان سے تھے۔ان کی ادبی زندگی کا آغاز لاہور سے ہوا تھا۔ پھر فلمی کہانیاں لکھنے کے ارادے سے ممبئی چلے گئے۔ جہاں آپ نے افسانے، خاکے، ڈرامے لکھے۔اس میں شک نہیں کہ ان کے خاکے بھی لاجواب ہیں لیکن جس چیز نے انہیں زندہ جاوید بنایا وہ افسانہ ہی ہے۔اپنے افسانوں میں انہوں نے جنسی کج روی کو موضوع بنایا ہے۔ان کا خیال تھا کہ غلاظت کو چھپانے کے بجائے اسے کریدنا اور صاف کرنا چاہئے، بلاشبہ اس سے بدبو پھیلتی ہے لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

منٹو نے جس دور میں آنکھیں کھولیں اُس وقت جاتی ہوئی بہاریں اور آتی ہوئی خزاؤں کے موسم کا دور تھا۔ بھارت جسے سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا، انگریزوں نے اسے لوٹ گھسوٹ کر تباہ و برباد کرڈالا تھا۔آزادیٔ وطن کی خاطر لوگ جگہ جگہ چھوٹی سبھائیں اور آندولن کررہے تھے جسے انگریز بڑی بے دردی سے کچل دیا کرتے تھے۔قتل وخوں ریزی اُن کے لیے عام بات تھی۔ٹرینوں کے فرسٹ کلاس کے ڈبوں میں بھارتیوں کو سفر کرنا ممنوع تھا۔ یہ انگریز ہمیں انڈین ڈاگ Indian Dog کہہ کر پکارتے تھے۔اِنہیں سب وجوہات کی بنا پر بھارتیوں نے متحد ہوکر انگریزوں کے سارے مظالم کے قلعے کو ڈھادیئے اور ملک بالآخر آزاد ہوگیا۔

آزادی کے بعد ملک کئی مسائل سے دوچار تھا۔سب سے بڑا مسئلہ غذا اور خوراک کا تھا روزی روٹی کا سامان کس طرح مہیا کیا جائے، بے روزگاری کیسے دور ہو؟ جدید ہندوستان کی تعمیر کیسے کی جائے؟ ہندوستان جسے سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا راجاؤں اور نوابوں نے اِسے عیاشی کا مرکز بنادیا تھا۔ ہندوستان کو ہندوستان والے خود تباہ کر چکے تھے۔ بھارت آزادی کے بعد بالکل ننگا کھڑا تھا لاپرواہی کی نیند سونے والے بھارتی اِسے دیکھ کر خود شرمارہے تھے۔ بھارت کا سب سے بڑا اور افسوس ناک پہلو جس کی مثال دنیا کے کسی معاشرے میں نہیں ملتی وہ عورت تھی! وہ عورت جسے راجاؤں اور نوجوانوں نے اپنی سیر وتفریح اور دِل بہلانے کا ذریعہ بنا رکھا تھا، حکمرانی ختم ہونے کے بعد محل سراؤں سے باہر نکل آئیں خود اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ

پالنے کے لیے، اپنے بزرگوں کے گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لیے پیشہ کرنے پر مجبور تھیں۔ مرد ایسی عورتوں سے کوئی رشتہ نہیں جوڑنا چاہتا تھا چاہے اُس کی بہن یا ماں ہی کیوں نہ ہو۔ عورت عورت کی دشمن ہوگئی تھی۔ شریف گھرانے کی نام نہاد عورتیں ایسی عورتوں سے پردہ کرتی تھیں۔ ایسی عورت کا کوئی پُرسان حال نہ تھا۔ منٹو جیسے عظیم افسانہ نگار نے اِن حالات و کردار کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ اس ناسور پر عمل جراحی سے کام لیا۔ جس کی بدبو سے تمام ماحول پراگندہ ہوجاتا تھا، ہر فرد اس کردار سے متنفر تھا۔ عورت کی نفسیات اس کے جسم کی بھوک مرد کی غرض اور خود غرضی ہر ہر پہلو ہر ہر نکتہ کو ماہر نفسیات کی طرح منٹو نے پیش کیا ہے۔ 'کالی شلوار'، 'بو'، 'ٹھنڈا گوشت'، 'بابو گوپی ناتھ' اور 'ہتک' حقیقت پر مبنی ایسے ہی افسانے ہیں جو سماج کے چہرے سے پردہ اُٹھاتے ہیں۔

منٹو نے اپنے افسانوں میں اپنے گرد و پیش کی زندگی کو ہی پیش کیا ہے۔ ایسے موضوعات کو اپنے افسانوں کا محور بنایا ہے جس پر قلم اُٹھانے کی جرأت (اس انداز میں) منٹو سے پہلے کوئی نہ کر سکا۔ منٹو نے خیالی اور طلسماتی دنیا پیش کرنے کے بجائے زندگی کی حسین رنگینیوں کی سیر کرائی ہے۔ کوہ قاف سے سبز پری اور لال پری کو لانے کے بجائے ہندوستانی عورت کے حُسن و جمال کے پَرتو دکھائے ہیں، عورت اور مرد کے جنسی تعلقات کا ذکر کیا ہے۔ اِس پر ان کو قانون اور سماج دونوں نے بُرا بھلا کہا اور جیل بھی بھیجا گیا۔ لیکن حقیقت کی عکاسی سے وہ کبھی گریزاں نہیں رہے۔ منٹو نے ثابت کردیا کہ یہ طبقہ خود غلاظت میں پھنسا ہے۔ پیشہ اس کا شوق نہیں۔

منٹو نے صرف طوائف کو ہی اپنے افسانوں کا موضوع نہیں بنایا بلکہ تقسیم ہند کے خونیں واقعات پیش کرنے میں بھی وہ کسی طرح پیچھے نہیں رہے اور جس پُر اثر انداز میں تقسیم ہند پر افسانے لکھے اس کی مثال نہیں ملتی۔ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' ایسے افسانوں میں خصوصیت کا حامل ہے۔

منٹو نے فسادات پر جو افسانے لکھے ہیں ان کے اندر فساد کے پیچھے کوئی سامراجی

ہاتھ نظر نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ منٹو نے فسادیوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ منٹو نے فسادات کے علاوہ ہنگامی موضوعات پر بھی زندہ رہنے والے کئی افسانے لکھے ہیں ایسے افسانوں میں ''نیا قانون'' لائق ذکر ہے۔

افسانہ نویسی کی تاریخ میں منشی پریم چند کا افسانہ ''کفن'' جب اپنی شہرت کا لوہا منوا رہا تھا اُس وقت منٹو نے افسانہ ''پھُندنے'' لکھ کر افسانہ نگاری کی دُنیا میں ہلچل مچادی تھی۔ یہ اُن کا نیا تجربہ تھا۔

منٹو کے اسلوب میں بڑی سادگی اور فطری پن ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں حسن کاری کے لیے لفظوں کی تراش خراش اور رنگین تشبیہات و استعارات سے کام کم لیتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر شمیم حنفی ''منٹو نے اپنے اسلوب پر کسی خارجی آرائش کا غلاف چڑھانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ان کی کہانیوں میں حسن کے تمام عناصر خود ان کی کہانیوں کے بطن سے نمودار ہوئے ہیں۔ جذبات کے خول' مبالغے کی چاشنی' خوبصورت اور انوکھی علامتوں اور رنگین و سحر طراز الفاظ کے جادو سے منٹو کی کہانیاں یکسر خالی ہیں۔''

اِنہیں سب وجوہات کی بنا پر منٹو کو سب سے بڑا افسانہ نگار کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ ان کے اندر ایک اچھے افسانہ نگار کی تمام صلاحتیں موجود تھیں۔ ادب اور سماج دونوں نے اُن کے فن کو سراہا ہے۔ زبان و بیان مکالمے اور اسلوب ہر اعتبار سے ان کے افسانوں میں اُردو ہی نہیں دنیا کی دیگر زبانوں خصوصاً مغربی ادب کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ طنز و مزاح کی لطیف لَے نے منٹو کے افسانے میں دوآتشہ کا کام کیا ہے۔ ایک ایک لفظ موتیوں کی طرح جڑا ہے۔ اُن کی اس ادابی خدمات کو کبھی بُھلایا نہیں جاسکتا۔

ڈاکٹر محمد تعظیم احمد کاظمی

تقسیمِ وطن اور منٹو کا ٹوبہ ٹیک سنگھ

ٹوبہ ٹیک سنگھ افسانے کو سمجھنے کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم قبل اس کے کہ اس افسانے پر بات کریں۔ تقسیمِ وطن پر تھوڑا چرچا کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آخر ایک پاگل بھی ذہنی کشمکش میں کیوں گرفتار ہوتا ہے۔ گویا کہ اس زمانے کا یہ ایک سلگتا موضوع تھا جس کو بڑی ہی فنکاری کے ساتھ منٹو نے پیش کیا ہے۔ میرا موضوع متذکرہ بالا افسانہ ہی ہے لیکن تھوڑی سی مہلت چاہتا ہوں کہ یہ مضمون اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کی تمہید میں چند باتیں ہو جائیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے:

''۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان مکمل طور سے آزاد ہوا لیکن یہ آزادی نہ صرف تقسیمِ ہند کا غمناک پیغام لائی بلکہ فرقہ وارانہ فساد میں ہندوستان کو جلتا ہوا چھوڑ گئی۔ معلوم ہوتا تھا شہر پر قاتلوں کا قبضہ ہے۔'' (حیات ابوالکلام آزاد، عبدالقوی دسنوی) ٹی اے۔ کاظمی و نعیم کوثر فرماتے ہیں:

''ملک تقسیم ہوا، ماں کی گود سونی ہوئی، عورت کا سہاگ اُجڑا، بچے یتیم ہوئے، عزت و ناموس کی دھجی بکھر گئی۔ (تزئین ادب)

'چھٹا دریا' میں فکر تونسوی رقم طراز ہیں:

''جوان معصوم کنواریوں کو مادر زاد ننگا کر کے خنجروں، کرپانوں اور تلواروں کے سائے میں اس لیے جلوس کی شکل میں گھمایا جاتا تھا کہ 'وید' 'قرآن' اور 'گرنتھ' کی یہ مقدس بیٹیاں اپنی کوکھ سے انسانِ نوجنم نہ دے سکیں''۔ اس طرح فکر تونسوی نے چھٹا دریا یعنی خون کا دریا کہ ہم سبھی اس بات سے واقف ہیں کہ پنجاب پنج آب یعنی پانچ دریاؤں کا ہے اور یہ چھٹا جو فکر تونسوی نے لکھا وہ ان کا روز نامچہ ہے۔ آزادی کا مژدہ لے کر جو وقت آیا وہ تقسیم بھی لایا اور شیطنت بھی اسی خون کا قصہ فکر تونسوی نے اس میں بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں'' دا گبہ کے پورب میں ایک بھی نمازی نہ رہا

اور مسجد میں تاش کھیلی جا رہی ہے، قرآن مقدس نالیوں میں پڑی ہے کہ واگہہ کے پچھم میں ایک بھی پجاری نہیں رہا دیوتاؤں کی مورتی کوڑے کرکٹ میں پڑی ہے۔''

اخترالایمان کا یہ شعر ؎

ہوا میں اچھلتے ہوئے ڈنٹھوں کی طرح شیر خواروں کو دیکھا تھا کٹتے
اور پستان بریدہ جواں لڑکیاں تم نے دیکھی تھیں کیا بَین کرتے

انڈیا ٹوڈے ۲۰؍اگست ۲۰۰۳ء میں جو ذکر ہے اسے اردو میں لکھ رہا ہوں۔ ۱۴؍اگست ۱۹۴۷ء کو بھارت مکت تو ہوا لیکن لہولہان اور دلوں میں نفرت..... ۱۳؍لاکھ لوگ مارے گئے ۱۵؍کروڑ لوگ ہجرت کر گئے۔ ایک لاکھ مہیلا کا بلاتکار ہوا۔ ۱۹۵۰ء تک روزانہ ۴۰۰۰ مسلمان پاکستان جانے والی ٹرین میں بیٹھ کر جاتے رہے۔ ۹۰؍لاکھ شرنارتھی پنجاب سے پاکستان گئے۔ شاید اسی پر فیض نے کہا تھا ؎

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

تقسیم وطن کا یہ المیہ اتنا زبردست تھا کہ انسان اس بات کو فراموش کر گیا کہ ۱۸۵۷ء بلکہ اس سے بھی پہلے جبکہ رام نرائن موزوں نے کہا تھا ؎

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مرگیا آخر تو ویرانے پہ کیا گزری

سراج الدّولہ کی ۱۷۵۷ء کی شکست پر کیا تھا۔ وہ آزادی انہیں ملی تھی لیکن انگریزوں کی شاطرانہ چال کامیاب ہو چکی تھی اور Devide and Rule کی اُن کی پالیسی کام کر گئی تھی تو آزادی کا جشن منانے کی بجائے ایک انسان دوسرے کا خون پینے کو باولا ہو گیا جبکہ سبھی نے ساتھ مل کر ملک کو آزاد کرایا تھا۔ نروپما دنت نے کہا۔

वारिषशाह को पुकारती आवाज सहारा समय मानुषी पुष्ट 21 28 February 2004 में निरूपमादन्त कहते हैं सन 1947! देश को स्वतंत्रता मिली और साथ साथ विभाजन भी .... पंजाब के पांच दरिया खून से रंग दिये गये ...... धर्म के नाम पर लुट गई हीर रांझा के प्रदेश की सैंकड़ो औरतें चारों ओर मातम छागया सब सहमें हुए और चुप ।

اس کے بعد امرتا پریتم کی شاعری ہے جس میں وہ وارث شاہ سے مخاطب ہیں۔زیادہ کی گنجائش نہیں اس لیے بات آگے بڑھاتا ہوں۔انڈیا ٹوڈے میں جس ریپ، بلاتکار اور زنا بالجبر کا ذکر آیا ہے اس کا جیتا جاگتا نمونہ منٹو کا افسانہ ''کھول دو'' ہے جس میں منٹو نے یہ دکھایا ہے کہ ایک بوڑھے باپ کا سہارا اس کی لڑکی اغوا کنندگانوں کی بھیڑ میں کھو جاتی ہے وہ Relief Centre میں تلاشتا پھرتا ہے بہرکیف ایک روز اس کی بیٹی اسپتال میں ملتی ہے جو بے ہوش ہے، ڈاکٹر اس کی نبض دیکھتا ہے تو کھڑکی کھولنے کو کہتا ہے تاکہ تازہ ہوا اس کو لگے اور وہ ہوش میں آجائے۔'کھول دو' کی آواز اس لڑکی کے کانوں میں پہنچ جاتی ہے اور نیم بیہوشی کی حالت میں ہی اس کے ہاتھ شلوار کے اِزار بند تک پہنچ جاتے ہیں اور وہ اِزار بند کھول کر شلوار نیچے سرکا دیتی ہے۔تقدیر کا یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ وہ لڑکی اتنی ٹوٹ چکی ہے جس کے ساتھ اتنے ریپ ہوئے ہیں کہ اس کی ساری تمیز یکسر غائب ہوکر رہ گئی ہے۔تبھی تو مشرف عالم ذوقی کہتے ہیں'' منٹو کی نشتریت....... اور اس کا سفاکانہ لہجہ جسم کی عمارت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔وہ زخمی بھی کرتا ہے اور نشتر بھی چبھوتا ہے۔'' یش پال نے جھوٹا سچ میں یہ دکھایا ہے کہ ''تقسیم تو راج نیتاؤں نے کرایا اور middle class انسانوں کا اس میں سب سے زیادہ نقصان ہوا۔۱۹۴۷ء کی یہ کٹھور سچائی ہے کہ دیش کا وِبھاجن ہوا ....لاکھوں پریوار نشٹ ہوئے۔''

ملک کی تقسیم کے وسیع و گہرے اثرات انسانوں پر پڑے اور پورے ادیب اس سے متاثر ہوئے۔Secularism کی افادیت پاش پاش ہوئی۔گاندھی جی کو بنگال جانا پڑا تو پنڈت نہرو دہلی میں امن کے بھکاری بنے رہے۔قطب الدین ایبک کا بسایا شہر ویران ہوا مزار کا نقصان ہوا تو گاندھی جی کو اس کا زبردست دھکا لگا اور انہوں نے برت رکھا کہ ہندو سکھ اس مزار کے نقصان کو اپنے پیسے سے اپنے گناہوں کی پاداش میں مرمت کرائیں۔خون سے لت پت آزادی تھی جس میں کھلے عام قتل و غارت گری اور ظلم و تشدد کی انتہا ہوگئی۔تقسیم وطن پر منٹو کے بہت سارے

افسانے ہیں۔ تبھی میں انہوں نے ان حالات کو بڑی فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔جس سے ان کے اسلوب میں تیکھا پن آ گیا ہے۔ان کے افسانوں میں نفسیاتی پہلو ملتا ہے ان سب کا نفسیاتی مطالعہ کر کے دوا تجویز کرتا ہے۔ تبھی تو ان کے افسانوں میں طنز جاری و ساری نظر آتا ہے۔ وہ سماج کے ان زخموں کو جو ناسور بنتا جا رہا ہے ننگا کر کے دکھاتا ہے۔''منٹو کو عطر میں ڈوبی عیش پسند دلہن سے زیادہ میل اور پسینے میں سڑتی ہوئی گھاٹن خوشبودار معلوم ہوتی ہے۔'' وہ شریف اور پاکباز بیویوں کے دل کے چور کو پکڑ لیتا اور کوٹھے میں رہنے والی رنڈی کے دل کے تقدس سے اس کا موازنہ کرتا ہے۔ منٹو کی ذہنیت شروع سے باغیانہ رہی ،اس کا پہلا افسانہ'تماشا' امرتسر سے نکلنے والا رسالہ'خلق' میں چھپا جو جلیان والا باغ کے خونیں حادثہ سے متعلق تھا جسے فرضی نام سے شائع کروایا تبھی تو پولس کے ظلم سے بچ گئے۔ اپنے افسانے پر اظہار خیال کرتے ہوئے خود منٹو نے کہا ہے ''زمانے کے جس دور سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں اگر آپ اس سے واقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیے اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ ناقابل برداشت ہے میری تحریر میں کوئی نقص نہیں۔جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے وہ دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے۔''ٹوبہ ٹیک سنگھ کے ذریعے اُنہوں نے اس زمانے کے سُلگتے مسائل کو پیش کیا ہے تبھی تو یہ ایک اچھوتا اور لازوال افسانہ بن گیا ہے۔

تقسیم ملک کے بعد پاگلوں کے بٹوارے کا فیصلہ ہوا۔ان بیچارے پاگلوں کو تو یہ پتہ بھی نہ تھا کہ پاکستان کیا ہے۔اس میں منٹو نے لاہور پاگل خانے کے ایک پاگل کو Centre point بنایا ہے۔ٹوبہ ٹیک سنگھ کا نام بشن سنگھ تھا جو ایک گاؤں ٹوبہ ٹیک سنگھ کا زمیندار تھا۔اس کی ایک بیٹی تھی۔ اسے پاگل ہوئے چودہ سال گذر چکے تھے۔اس کے گھر والے اس سے ہر مہینے ملنے آتے تھے۔ جب بشن سنگھ کو یہ معلوم ہوا کہ دونوں ملکوں کے پاگلوں کا تبادلہ ہو رہا ہے تو وہ اس بات سے پریشان ہے کہ اس کا گاؤں کس ملک میں ہے۔اس کے گاؤں کا دوست فضل دین جس نے اس کے گھر والوں کو بہ حفاظت سرحد پار کروا دیا تھا وہ بھی بشن سنگھ کے سوال کا جواب نہیں دے پاتا کہ دوست کی محبت عود کر آ جاتی ہے۔بشن سنگھ کو پاگلوں کے تبادلہ کے لیے واگھہ سرحد پر لے جایا جاتا ہے وہاں

کے ایک آفیسر سے پوچھنے پر بشن سنگھ کو پتہ چلتا ہے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے تو وہ پاکستانی سرحد میں آ چھپنے کی سعی کرتا ہے لیکن پاکستانی پولیس اسے دوبارہ واگھہ سرحد پر پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ چلنے سے انکار کر دیتا ہے۔ٹوبہ ٹیک سنگھ یہاں ہے ....اور زور زور سے چلاّنے لگا ''اوپڑ دی گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دلی منگ دی دال آف ٹوبہ ٹیک سنگھ آف پاکستان''!اس کی موت کو منٹو نے کس دکھ بھرے انداز میں پیش کیا ہے'سورج نکلنے سے پہلے ساکت وصامت بشن سنگھ کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی .....ادھر ادھر کئی افسر دوڑے آئے اور دیکھا کہ وہ آدمی جو پندرہ برسوں تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہتا تھا،اوندھے منہ لیٹا ہے....ادھر خاردار تاروں کے پیچھے ہندستان تھا....ادھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان ،درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہ تھا ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا۔ٹوبہ ٹیک سنگھ کی زندگی کس کرب میں گزرتی ہے لیکن اس کی موت کو افسانہ نگار نے لازوال بنا دیا جو نہ پاکستان ہے اور نہ ہندوستان بلکہ جس کا نام ہی ہے Noman's land۔اس تقسیم نے ایک ملک کے دو ٹکڑے ایسے کئے کہ بیچ میں نہ صرف یہ کہ خاردار تار ہے بلکہ پڑوسیوں کو بھی اس طرح بانٹ دیا جو سالہا سالوں سے ایک ساتھ رہتے چلے آرہے تھے۔جن کی زندگی کی ساری activities ایک ساتھ چل رہی تھیں اسے سیاست دانوں نے بانٹ دیا ہے بلکہ سیاست کے ان ٹھیکیداروں نے تو جیل کے قیدیوں اور پاگل خانے کے پاگلوں تک کو بانٹ دیا جو خود دنیا سے بیگانے تھے۔جنہیں یہ تک نہیں پتہ کہ ہندوستان میں ایک دوسرا ملک پاکستان کہاں سے آ گیا۔اس میں لاہور کے پاگل خانے کا جو نقشہ منٹو نے کھینچا ہے اس کی چند تصویریں پیش ہیں۔

''ایک مسلمان پاگل جو بارہ برس سے ہر روز باقاعدگی کے ساتھ 'زمیندار' پڑھتا تھا اس سے جب اس کے دوست نے پوچھا،مولوی صاحب یہ پاکستان کیا ہوتا ہے!اس نے بڑے غور وفکر کے بعد جواب دیا''ہندوستان میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں استرے بنتے ہیں''۔ایک سکھ پاگل نے ایک دوسرے سکھ پاگل سے پوچھا سردار جی!ہمیں ہندوستان کیوں بھیجا جا رہا ہے ہمیں تو وہاں کی بولی نہیں آتی،دوسرا مسکرایا،مجھے تو ہندستوڑوں کی بولی آتی ہے۔ہندوستانی بڑے شیطان اکڑ اکڑ

پھرتے ہیں۔ایک دن نہاتے نہاتے ایک مسلمان پاگل نے" پاکستان زندہ باد" کا نعرہ اس زور سے بلند کیا کہ فرش پر پھسل کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔بعض پاگل ایسے بھی تھے جو پاگل نہیں تھے اکثریت قاتلوں کی تھی ،رشتہ داروں نے افسروں کو دے دلا کر پاگل خانے بھیجوا دیا تھا تا کہ پھانسی کے پھندے سے بچے رہے۔ایک پاگل نے ہندوستان و پاکستان کے چکّر میں اور پاگل ہو گیا۔ میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ پاکستان میں.... میں اس درخت پر ہی رہوں گا۔ایک M.Sc. پاس Radio Engineer پر اس کا یہ اثر ہوا کہ وہ کپڑے اتار کر مادر زاد ننگ دھڑنگ ہی باغ میں گھومنے لگا۔مسلم لیگ کا سرگرم رکن جو پاگل ہو گیا تھا محمد علی نام تھا اس نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ قائدِ اعظم محمد علی جناح ہے اور ایک سکھ ماسٹر تارا سنگھ بن گیا۔لاہور کا ایک ہندو وکیل جو محبت میں ناکام ہو کر پاگل ہو گیا تھا وہ تمام دن ہندو و مسلمان لیڈروں کو گالی دیتا کہ ان لوگوں نے مل کر ملک کے ٹکڑے کر دیے اس کی محبوبہ ہندوستانی بن گئی اور وہ پاکستانی۔Anglo Indian اس بات کو لے کر پریشان تھے کہ انگریز چلے گئے ہندوستان آزاد ہوا تو Europeon Ward رہے گا کہ ختم کر دیا جائے گا۔انہیں Breakfast میں ڈبل روٹی کے بدلے بلاڈی انڈین چپاتی (Bloody Indian Chapati) تو زہر مار نہ کرنی پڑے گی۔ایک تو خود کو خدا ہی کہتا تھا۔

یہ بات اپنی جگہ حقیقت ہے کہ پاکستان و ہندوستان یعنی ملک کا بٹوارہ کوئی بھی عام انسان نہیں چاہتا تھا۔خود گاندھی جی نے بھی کہا تھا کہ ملک کا بٹوارہ میری لاش پر ہوگا مگر حالات ایسے بنے کہ بٹوارہ ہوا۔اس بٹوارے میں خواہ جس کا بھی ہاتھ ہو ویر ساورکر ہوں کہ علامہ اقبال کی تھیوری۔ جناح ہوں کہ پٹیل لیکن چند مفاد پرستوں کے چلتے بٹوارہ ہوا اور انگریزوں کی عفریت بھری چال نے آزادی تو دی مگر بٹوارہ بھی کیا۔لاکھوں بے گھر ہوئے تو کیا کیا نہ جور و ظلم ہوا۔بات اتنے پر بس نہیں رہا بلکہ آج بھی ہندوستان و پاکستان ایک اچھے پڑوسی کی طرح نہ رہ کر بار بار دشمنی پر اُتر آتے ہیں۔منٹو نے اس افسانے کے ذریعے اس وقت کے قصورواروں کے منہ پر پاگلوں کے ذریعے وہ طمانچہ مارا ہے جس کی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے۔

☆☆☆

منیر حسین حُر ہ

منٹو: شخصیت کا مختصر ترین مطالعہ

سعادت حسن منٹو نسلاً کشمیری تھا۔ ان کے آبا و اجداد کشمیر سے تعلق رکھتے تھے۔ منٹو کی ولادت ۱۱ر مئی ۱۹۱۲ء کو لدھیانہ، پنجاب میں ہوئی۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ ان کے اجداد کشمیر سے لدھیانہ آ کر بس گئے تھے۔ منٹو کا آبائی مکان کوچہ وکیلاں امرتسر میں تھا۔ ان کے والد کا نام غلام حسن تھا، وہ پیشہ کی حیثیت سے منصف تھے۔ انہوں نے دو شادیاں کیں۔ جس کا بُرا اثر منٹو کی زندگی پر پڑا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر کہکشاں پروین لکھتی ہیں ''پہلی بیوی سے انہیں تین لڑکے تھے جن کی تعلیم ولایت میں ہوئی تھی۔ منٹو کی ایک سگی بہن تھی، جن کا نام ناصرہ اقبال تھا۔

منٹو کی زندگی کے ابتدائی حالات بھی ٹھیک نہیں تھے۔ والد کی سخت گیری، بھائیوں کی بے رُخی اور والد کی موت کے بعد عزیزوں کے ہاتھوں ان کے حقوق کا استحصال وغیرہ ایسی باتیں تھیں جنہوں نے منٹو کے ذہن کو دائمی طور پر متاثر کیا۔'' اس طرح صاف ظاہر ہوتا ہے کہ منٹو پر ابتدا سے ہی غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ دوسری طرف غمِ روزگار کے اِک سنگین مرحلے سے بھی گزرنا پڑا۔ جس کی فکر انسانی زندگی کو ابتر بنا دیتی ہے۔

منٹو کی ساری زندگی ناموافق حالات میں گزری۔ منٹو بچپن سے ہی پڑھنے لکھنے سے دُور بھاگتے تھے۔ جب انہیں اسکول بھیجا جاتا تو وہاں دو چار آوارہ گرد لڑکوں کے ساتھ مل کر مستی میں مصروف رہتے تھے اور انہوں نے ایک ڈرامیٹنگ کلب بھی کھولا تھا۔ پڑھائی سے دور رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ دسویں میں دوبارناکام ہوئے۔

خاص بات یہ ہے کہ وہ اُردو کے پرچے میں ناکام رہے۔اس کے علاوہ اور کئی امتحانات میں بھی ناکام رہے جس سے پوری طرح دلبرداشتہ ہوئے اوران کی دلچسپی پڑھائی سے کم ہوگئی۔ان کا ذہن انتشار میں مبتلا ہوا۔ان کے ذہنی انتشار کو باری علیگ نے دُور کیا۔اورانہیں اردو رسائل سے روشناس کرایا۔اورنئی راہ دکھائی۔منٹو کو لکھنے کی ترغیب اورتربیت دی اور پھر فلمی خبروں کا کالم لکھنے کے لئے انہی کو منتخب کیا۔منٹو کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۴ء میں مترجم کی حیثیت سے ہوا۔

باری علیگ نے ایک بڑا کمال کر کے دکھایا کہ منٹو کے اندر مطالعہ کا شوق اس طرح بڑھ گیا کہ وہ چلتے پھرتے بھی مطالعہ کے نشے میں رہتے تھے۔اور لکھتے بھی تھے۔یہ وہی وقت تھا جب ''خلق'' کے پہلے ہی شمارے میں منٹو کا سب سے پہلا طبع زادافسانہ''تماشا'' شائع ہوا تھا۔منٹو نے خود اس کا اعتراف ان الفاظ میں کیا۔'' آجکل میں جو کچھ ہوں اس کے بنانے میں سب سے پہلا ہاتھ باری صاحب کا ہے۔اگر امرتسر میں ان سے ملاقات نہ ہوتی اور متواتر تین مہینے ان کی صحبت میں نہ گزارے ہوتے تو یقیناً میں کسی اورراستے پر گامزن ہوتا۔''منٹو کو جھوٹ ،دھوکہ دہی اور ریاکاری سے سخت نفرت تھی۔زندگی میں جو کچھ گزرا وہ افسانوں میں لکھ ڈالا۔

منٹو لکھتے ہیں۔''میرے اصلاح خانے میں کوئی شانہ نہیں،کوئی شیمپو نہیں،کوئی گھونگر پیدا کرنے والی مشین نہیں۔میں بناؤ سنگھار کرنا نہیں جانتا۔آغا حشر کاشمیری کی بھینگی آنکھ مجھ سے سیدھی نہ ہوسکی۔اس کے منہ سے گالیوں کے سوائے میں پھول نہیں جھڑا سکا۔میراجی کی غلاظت پر مجھ سے استری نہ ہوسکی اور نہ ہی میں اپنے دوست شیام کو مجبور کرسکا کہ وہ برخود غلط عورتوں کو سالیاں نہ کہے۔اس کتاب میں جو بھی فرشتہ آیا ہے اس کا مُونڈن ہوا ہے اور یہ رسم میں نے بڑے سلیقے سے ادا کی ہے۔منٹو زندگی کے ہر طور طریقے

سے واقف ہوتے گئے۔ کیونکہ وہ زندگی کے ہر موڑ پر اس کے نشیب وفراز سے گزرتے تھے۔ حقیقت نگاری ان کا اصول تھا۔ اسی حقیقت نگاری کے فن کا سہرا منٹو کے سر جاتا ہے۔ ۱۹۳۵ء میں منٹو ممبئی گئے۔ وہاں فلمی دنیا سے وابستہ ہوگئے۔ ۱۹۳۶ء کے نصف اول میں ان کے طبع زاد افسانوں کا مجموعہ ''آتش پارے'' شائع ہوا۔ آغاز سے آخر تک تقریباً منٹو کی ۴۷ کتابیں منظر عام پر آئیں۔ ان میں افسانے، ریڈیو ڈرامے، فیچرس، مضامین، خاکے، فلم اسکرپٹ اور ایک ناول شامل ہے۔

پروفیسر شمس الحق عثمانی لکھتے ہیں ''منٹو کی موت کے بعد ان کے خطوط کا ایک مجموعہ اور ایسے متعدد افسانے، رسالوں اور کتابوں میں طبع ہوئے جو ان کے حین حیات میں مرتب نہ ہوسکے تھے۔ منٹو کی یہ مرتب ومنتشر تحریریں کئی ہزار صفحات پر مشتمل ہیں جو بلاشبہ اردو زبان وادب کا اہم اثاثہ ہیں۔'' یہاں یہ بات بتانا مقصود ہے کہ پروفیسر شمس الحق عثمانی نے کلیات منٹو کی تحقیق، تدوین، ترتیب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی وساطت سے شائع کی۔ یہ اردو ادب جاننے والوں کے لیے مرہون منت ہے۔ یہ کلیات منٹو کی کتابوں کے زمانہ اشاعت کے لحاظ سے ترتیب دی گئی ہے۔ مصنف نے اس کلیات کی ترتیب میں منٹو پر پہلی کتاب یا ان کے حین حیات میں کتاب کی آخری اشاعت کو بنیادی نسخہ بنایا ہے۔ کلیات میں متن کی تصحیح کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔

غرض منٹو نے زندگی کو جتنا قریب سے دیکھا کسی اور نے شاید نہ دیکھا ہوگا۔ وہ خود زندگی سے دلچسپی رکھتے تھے۔ منٹو نے باپ کی سخت مزاجی، ماں کی نرمی اور سوتیلے بھائیوں کی بہتر معاشی حالت سے ان کی شخصیت میں احساس کمتری نے جنم لیا۔ جس کے نتیجے میں وہ ذہنی اضطراب میں مبتلا ہوئے۔ جو ان کے خطوط سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ ایک خط میں احمد ندیم قاسمی کو لکھتے ہیں۔ ''مجھے اپنے آپ سے کبھی تسکین نہیں ہوئی ایسا محسوس

ہوتا ہے کہ میں جو کچھ ہوں، جو کچھ میرے اندر ہے وہ نہیں ہونا چاہے اس کی بجائے کچھ اور ہونا چاہے''۔

فنی لحاظ سے جب منٹو کی ادبی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

پہلا دَور ۱۹۳۴ء جس میں ان کے ابتدائی افسانے نظر آتے ہیں۔ اور جو رسالہ ''خلق''، ''ساقی'' اور ''علی گڑھ'' میں شائع ہوئے۔ ان ہی افسانوں کا مجموعہ ''آتش پارے'' کے نام ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ ان کا اوّلین افسانہ ''تماشا'' تھا۔ اور یہ بات بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اوّلین افسانوں میں کوئی بھی افسانہ جنسی موضوعات پر مبنی نہ تھا۔

دوسرا دَور ۴۷۔۱۹۳۷ء تک اس عرصہ میں منٹو نے آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ڈرامہ نگار کی حیثیت سے ملازمت کی جو ڈیڑھ سال پر محیط ہے۔ تقسیم ملک کے بعد ہندوستان سے ہجرت کرنے تک ممبئی میں قیام کیا۔ اس عرصہ میں بھی وہ خاموش نہیں بیٹھے بلکہ کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ان میں ''مصور'' نام کا پرچہ فلمی میدان میں متعارف کیا بلکہ روشن کیا۔ اس کے علاوہ کئی رسالوں میں بحیثیت مدیر فرائض انجام دیے۔ ان کے ہم عصر ادیبوں میں جن کے ساتھ کام کیا ان میں کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، دیویندر ستیارتھی، ن، م، راشد وغیرہ۔ اس دور میں جو مجموعے شائع ہوئے ان میں ''منٹو کے افسانے'' ۱۹۴۰ء ''دھواں'' ۱۹۴۱ء ''افسانے اور ڈرامے'' ۱۹۴۳ء لذت سنگ'' ۱۹۴۷ء۔

تیسرے دَور میں جو ۵۵۔۱۹۴۸ء پر محیط ہے۔ اس میں منٹو آٹھ جنوری ۱۹۴۸ء کو ہندوستان سے ہجرت کر کے لاہور چلے گئے۔ اور موت نے اُنہیں وہاں فرصت نہ دی نہ ہی پاکستان کی عکاسی کرنے کا موقع دیا۔

۱۸ر جنوری ۱۹۵۵ء کو اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ اس دور کے منظر عام پر آنے والے افسانوی مجموعے 'چغد' ۱۹۴۸ء 'خالی بوتلیں خالی ڈبے' ۱۹۵۰ء، 'بادشاہت کا خاتمہ' ۱۹۵۰ء، 'یزید' ۱۹۵۱ء، 'اُوپر نیچے اور درمیان' ۱۹۵۴ء، 'بغیر اجازت' ۱۹۵۵ء، 'برقعے' ۱۹۵۵ء 'رتی، ماشہ، تولہ' ۱۹۵۶ء اس کے علاوہ افسانچوں کا مجموعہ 'سیاہ حاشیے' اسی سے منٹو نے منی کہانی کی بنیاد ڈالی، اس میں افسانہ 'مزدوری' جو ایک کشمیری ماتو کی کہانی ہے اور ملامت وغضب اور فحش سے لبریز افسانے 'ٹھنڈا گوشت' 'کھول دو'، 'اُوپر نیچے اور درمیان' اور 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' اسی دور کے ادبی شاہکار ہیں۔

منٹو کے انتقال کے بعد جو مجموعے شائع ہوئے۔ ان میں 'نمرود کی خدائی'، 'سرکنڈوں کے پیچھے'، 'پھندے'، 'ٹھنڈا گوشت'، 'چشم زدن'، 'گلاب کے پھول'، 'مجذوب کی بڑ' وغیرہ ہیں۔

منٹو کی آخری ادبی خواہش پنجاب کی بولیوں کو جمع کر کے چھپوانا تھا۔ منٹو کی موت کو آج پچاس سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے، لیکن منٹو کا فن زندہ جاوید ہے۔ منٹو پر ہر دور میں الزام لگائے گئے ہیں اور یہ بھی کہا گیا کہ اس کے افسانے نا قابل برداشت ہیں۔ اس کا جواب خود منٹو اس طرح دیتے ہیں لکھتے ہیں۔

''زمانے کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں، اگر آپ اس سے واقف نہیں ہیں تو میرے افسانے پڑھئے اور اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب ہے کہ زمانہ نا قابل برداشت ہے۔ میری تحریر میں کوئی نقص نہیں ہے جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے وہ دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے۔''

منٹو پر فحش نگاری کے الزامات عائد کیے گئے۔ مقدمات چلائے گئے، مجرم قرار دیا گیا۔ جرمانے ہوئے، قید و بند کی سزا بھی سنائی گئی۔ بلکہ اس کے برعکس منٹو ایک اخلاقی

فن کار تھا۔ممتاز شیریں لکھتی ہیں۔''منٹو ایک سچا، دیانت دار فطری فن کار تھا۔اس نے جو کچھ لکھا، بھر پور خلوص اور ایمان داری سے لکھا۔منٹو میں اظہار کی مسلسل تڑپ تھی، ایک شدید اندرونی لگن، ایک آگ جس میں وہ ہمیشہ تپتا رہتا تھا۔ جو فنکار کی بقا کے لیے بیحد ضروری ہے''۔

مختصراً یہ کہ منٹو کی موت نے جہاں اردو افسانے کو تنہا چھوڑ دیا وہیں اردو ادب کا نصف حصہ بجھ گیا بلکہ محروم ہو گیا۔ان کی زندگی میں ان کے فن کی وہ قدر نہ ہو سکی جو ہونی چاہئے اس کے برعکس منٹو نے رومانیت کی روایت کو رد کر کے ایک نئے ادب کی بنیاد ڈالی جو جذبات اور حقیقت پر مبنی ہے۔اس طرح آج برسوں کے بعد منٹو کا قلم زندہ ہے اور اس کی راہ حقیقت زندہ ہے بلکہ بیاں ہو رہی ہے۔

اوسیکر شہناز بانو علی مظہر

سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری

سعادت حسن منٹو ایک بہت ہی کامیاب افسانہ نگار تسلیم کئے گئے ہیں۔ پریم چند کے بعد افسانہ نگاروں کی جو نسل سامنے آئی اُس میں وہ بہت اہم مقام رکھتے ہیں۔ منٹو کی شناخت عام طور پر ایک فحش افسانہ نگار کی حیثیت سے ہوتی ہے۔ منٹو خود لکھتے ہیں کہ میں افسانہ نہیں لکھتا، افسانہ مجھے لکھتا ہے۔ منٹو نے اپنی کہانیوں میں نفرت کی نِگاہ سے دیکھے جانے والے طبقے کی تصویر کشی کی ہے۔ انہوں نے ہر طبقے اور ہر طرح کے انسانوں کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اور اُن کی ذہنی کشمکش کو سمجھ کر ہی اُن پر قلم اُٹھایا۔

بعض نقادوں کا کہنا ہے کہ "منٹو نے اپنے افسانوں میں جنس کو عام زندگی سے الگ کر کے دیکھنے کی کوشش نہیں کی"۔ جنسی استحصال کے پس منظر میں منٹو نے زندگی کی ناہمواریاں اُجاگر کیں۔ منٹو نے اپنی کہانیاں پابندی سے آزاد ہو کر لکھی ہیں۔ اس لیے ان کی ان کہانیوں میں جوش روانی اور ایک تازگی کا احساس ہوتا ہے اور جنسی موضوعات سے تعلق رکھنے والی یہ کہانیاں منٹو کی دوسری کہانیوں کے مقابلے میں زیادہ کامیاب نظر آتی ہیں۔

فکر و خیال کے اعتبار سے منٹو ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ اور حقیقت نگاری کا فریضہ ادا کیا۔ منٹو کا فن بہت اہم ہے۔ فنّی لوازمات برتنے میں اُنہیں بہت مہارت حاصل ہے۔ وہ کنایے اور اشارے سے جذبات نگاری کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ منٹو کے کرداروں کی دنیا زندگی کے تلخ حقائق پر مبنی ہے۔ اُن کے نزدیک بہترین آرٹ کی خوبی یہی ہے کہ حقائق کو لوگوں کے سامنے عریاں کر کے رکھا جائے۔ منٹو اپنے پلاٹ کی تشکیل بارونق شہروں سے کرتے ہیں وہ سماج میں پھیلی گندگی کو منظر عام پر لانا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ خوبیوں سے زیادہ خامیوں پر نگاہ ڈالتے ہیں۔

وہ خود لکھتے ہیں کہ چکی پیسنے والی عورت جو دن بھر کام کرتی ہے اور رات کو اطمینان سے سو جاتی ہے میرے افسانے کی ہیروئن نہیں ہو سکتی۔ میری ہیروئن چکلے کی ایک عورت ہو سکتی ہے جو رات کو جاگتی ہے اور دن کو سونے میں کبھی کبھی یہ ڈراؤنا خواب دیکھ کر اُٹھ بیٹھتی ہے کہ بڑھاپا اس کے

دروازے پر دستک دینے آیا ہے۔ منٹو کے اُوپر فحش نگاری کے جُرم میں مقدمے چلے اور انہیں عریاں نگار کہا گیا۔ لیکن منٹو کہتے ہیں کہ ''میں غلاظت کو چھپاتا نہیں بلکہ اسے صاف کرتا ہوں۔'' جنسی افسانوں کے علاوہ بھی منٹو نے بہت سے کامیاب افسانے لکھے ہیں۔ کچھ افسانوں میں نوعمری کے رومان کی جھلک ہے۔ شوخی، شرارت ہے تو کہیں سیاسی حالات کی طرف اشارہ۔ اُن کا پہلا افسانہ 'تماشا' ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ اُس کا موضوع جلیان والا باغ کا حادثہ ہے۔ ۱۹۳۸ء میں 'نیا قانون' شائع ہوا۔ ۱۹۴۰ء میں ان کے افسانوں کا مجموعہ 'منٹو کے افسانے' شائع ہوا۔ انہوں نے کل ۳۰۰/افسانے لکھے۔ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' ان کا شاہکار افسانہ ہے۔ جس میں تقسیم وطن اور تبادلۂ آزادی کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے اور اپنے کرداروں کے ذریعے سیاسی رہنماؤں کا مذاق اُڑایا ہے۔

منٹو کے افسانوں میں کردار نگاری تمام خوبیوں کے ساتھ اُجاگر ہوتی ہے۔ کردار حقیقت کی پوری تصویر کشی کرتے ہیں۔ کردار نگاری سے منٹو انسانی نفسیات کے گہرے مطالعے کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ 'ہتک' میں سوگندھی' کالی شلوار' میں سلطانہ کا جو کردار منٹو نے پیش کیا ہے اس کی مثال اردو افسانوں میں کم ہی ملے گی۔ منٹو کا اسلوب سادہ اور سچائی پر مبنی ہے۔ وہ تشبیہات اور استعارات سے کم کام لیتے ہیں۔ منٹو کے ہر کردار میں خامی ہونے کے باوجود ہمیں ان سے ہمدردی ہے۔ منٹو کے فن میں ہی منٹو کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔

ممتاز قریشی کے خیال میں' منٹو ایک فطری فنکار ہیں، اُن کے یہاں انسانی ہمدردی کا جذبہ اور مظلوم کی حمایت کا جوش ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ منٹو کو دنیا کی بدصورتی سے شکایت ہے، دِل ٹوٹتا ہے، وہ اسے سُدھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے پاس معمولی باتوں کے لیے غیر معمولی انداز موجود ہے۔ منٹو خود لکھتے ہیں کہ ''زمانے کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اگر آپ اس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیئے، اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ ناقابل برداشت ہے۔ مجھ میں جو برائیاں ہے وہ اسی عہد کی برائیاں ہیں۔ میری تحریر میں کوئی نقص نہیں۔''

☆☆☆

منٹو

دُبلا ڈیل، سوکھے سوکھے ہاتھ پاؤں، میانہ قد، چمپئی رنگ، بے قرار آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک، کریم کلر کا سوٹ، سُرخ چہچہاتی ٹائی، ایک دھان پان سا نوجوان مجھ سے ملنے آیا۔ یہ کوئی چوبیس پچیس سال اُدھر کا ذکر ہے۔ بڑا بے تکلّف، تیز طرّار، چرب زبان۔ بولا "میں منٹو ہوں، سعادت حسن منٹو۔ آپ نے ہمایوں کا روسی ادب نمبر دیکھا ہوگا۔ اب میں ساقی کا فرانسیسی ادب نمبر نکالنا چاہتا ہوں۔"

پہلی ہی مُلاقات میں اُس کی یہ ضرورت سے بڑھی ہوئی بے تکلفی طبیعت کو کچھ ناگوار گزری۔ میں نے اُس کا پانی اُتارنے کے لیے پوچھا۔ "آپ کو فرانسیسی آتی ہے؟"

بولا "نہیں!"

میں نے کہا "تو پھر آپ کیا کرسکیں گے؟"

منٹو نے کہا۔ "انگریزی سے ترجمہ کرکے میں آپ کا یہ خاص نمبر ایڈٹ کروں گا۔"

میں نے کہا "اپنا پرچہ تو میں خود ہی ایڈٹ کرتا ہوں۔ پھر ساقی کے چار خاص نمبر مقرر ہیں۔ ان کے علاوہ اور کوئی نمبر فی الحال شائع نہیں ہوسکتا۔"

منٹو نے دال گلتی نہ دیکھی تو فوراً اس موضوع ہی کو ٹال گیا۔ اور رخصت ہونے سے پہلے مجھ پر واضح کرگیا کہ اگر کسی مضمون کی ضرورت ہو تو معاوضہ بھیج کر اُس سے منگایا جاسکتا ہے۔

اس زمانے میں منٹو ترجمے ہی کیا کرتا تھا۔ اُس کی کتاب "سرگزشتِ اسیر" چھپ کر آئی تھی۔ منٹو سے کبھی کبھی خط و کتابت ہوتی رہی اور اُس کے چند مضامین ساقی میں چھپے

بھی، مگر قلبی تعلقات اُس سے قائم نہ ہو سکے ۔ مجھے یہی گمان رہا کہ یہ شخص بہت بہکا ہوا ہے۔ شیخی خوار اور چھچھورا سا آدمی ہے۔ اس میں ''مَیں'' سما گئی ہے۔ زمانے کی چھری تلے آئے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

معلوم ہوا کہ بڑا کٹر کمیونسٹ ہے اور مُسلم یونیورسٹی سے اسے یہ کہہ کر نکال دیا گیا ہے کہ تم کو دِق ہے۔ علی گڑھ سے نکالے جانے کے بعد وہ اپنے گھر امرتسر چلا گیا۔ گھر والے بھی اس کے باغیانہ خیالات سے نالاں تھے۔ اس لیے اُن سے بھی بگاڑ ہو گیا تھا، امرتسر میں اپنے چند ہم خیال دوستوں کے ساتھ اس نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ان کے لیڈر 'کمپنی کی حکومت' والے باری (علیگ) تھے۔ مگر یہ سب لوگ تو کچھ دبے دبے سے رہے، اس لیے حکومت کی قید و بند سے بچے رہے۔ پھر باری رنگون چلے گئے اور منٹو ممبئی جا کر اخبار 'مصوّر' میں نوکر ہو گیا۔

کئی سال گزر گئے۔ منٹو سے ایک آدھ ملاقات اور ہوئی، مگر دل کی بِچاری اُن سے اب بھی نہ کھلی۔ جیسا اور بہت سے مضمون نگاروں سے تعلق تھا اُن سے بھی رہا۔ یہاں تک کہ پچھلی بڑی جنگ کے زمانے میں وہ دلّی ریڈیو میں آ گئے۔ اور اب جو اُن سے پہلی ملاقات ہوئی تو انہوں نے چُھوٹتے ہی کہا۔

''اب میں آپ سے معاوضہ نہیں لوں گا۔''

میں نے پوچھا ''کیوں؟''

بولے ''معاوضہ میں اس لیے لیتا تھا کہ مجھے پیسوں کی ضرورت رہتی تھی۔''

دلّی ریڈیو اسٹیشن پر جنگ کے زمانے میں ادیبوں اور شاعروں کا بڑا اچھا جمگھٹا ہو گیا تھا۔ احمد شاہ بخاری (پطرس) کنٹرولر تھے، خبروں کے شعبے میں چراغ حسن حسرت اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، پروگرام کے شعبے میں ن م۔ راشد۔ انصار ناصری۔ محمود نظامی اور کرشن چندر۔ ہندی کے مسودہ نویس اوپندر ناتھ اشک اور اردو کے منٹو اور میرا جی تھے۔ اس زمانے میں منٹو کو بہت قریب سے دیکھنے کا مجھے موقع ملا۔

منٹو نے کچھ روپے جمع کر کے دو ٹائپ رائیٹر خرید لیے، ایک انگریزی کا اور ایک اردو کا۔ اُردو کا ٹائپ رائیٹر وہ اپنے ساتھ ریڈیو اسٹیشن روزانہ لاتے تھے۔ منٹو کے ذمّے جتنا کام تھا اس سے وہ کہیں زیادہ کرنے کے خواہش مند رہتے تھے۔ روزانہ دو تین ڈرامے اور فیچر لکھ دیتے۔ لکھنا تو انہوں نے بالکل چھوڑ ہی دیا تھا۔ کاغذ ٹائپ رائیٹر پر چڑھایا اور کھٹا کھٹ ٹائپ کرتے چلے جاتے۔ فیچر لکھنا اس زمانے میں بڑا کمال سمجھا جاتا تھا، مگر منٹو کے لیے یہ بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ذرا سی دیر میں فیچر ٹائپ کر کے بڑی حقارت سے پھینک دیا جاتا کہ... ''لو یہ رہا تمہارا فیچر!''

منٹو کی اس تیز رفتاری پر سب حیران ہوتے تھے۔ چیز بھی ایسی جچی تلی ہوتی کہ کہیں اُنگلی دھرنے کی اُس میں گنجائش نہ ہوتی۔

دلّی آنے کے بعد منٹو کی افسانہ نگاری کا دَورِ جدید شروع ہوا۔ انہوں نے طبعزاد افسانے ایک اچھوتے انداز میں لکھنے شروع کیے۔ ساقؔی کے لیے ہر مہینے ایک افسانہ بغیر مانگے مِل جاتا۔ '' دھواں'' اسی ریلے میں لکھا گیا۔ اور اس کی اشاعت پر دلّی کے پریس ایڈوائزر نے مجھے اپنے دفتر بُلوایا۔ وہ پڑھا لکھا اور بھلا آدمی تھا، انگریزی ادبیات میں میرا ہم جماعت بھی رہ چکا تھا۔ بولا '' بھائی ذرا احتیاط رکھو، زمانہ بُرا ہے۔'' بات آئی گئی ہوئی، میں نے منٹو سے اس کا ذکر کیا، حسبِ عادت بہت بگڑا مگر ساقؔی کے باب میں کچھ احتیاط برتنے لگا۔

لیکن یہ ناسُور دلّی میں بند ہوا، تو لاہور میں پھُوٹا اور 'بُو' پر حکومتِ پنجاب نے منٹو کو دھر لیا۔ صفائی کے گواہوں میں منٹو نے مجھے بھی دلّی سے بلوایا تھا۔ عدالتِ ماتحت تو قائل نہ ہو سکی۔ لیکن اپیل میں غالباً منٹو بری ہو گئے تھے۔ اس کے بعد رہا سہا خوف بھی منٹو کے دل سے نکل گیا اور انہوں نے دھڑلے سے 'فحش' مضامین لکھنے شروع کر دیئے۔ حکومتِ پنجاب کے پریس ایڈوائزر چودھری محمد حسین ایک عجیب و غریب بُزرگ تھے، تھے تو علاّمہ اقبالؔ کے حاشیہ نشینوں میں سے مگر انہیں یہ زعم تھا کہ اقبال کو اقبال میں نے بنایا ہے۔ یہ صاحب ہاتھ

دھو کر منٹو کے پیچھے پڑ گئے۔ اور یکے بعد دیگرے انہوں نے منٹو پر کئی مقدمات قائم کرا دیئے۔ پھر اُن کا نشہ اقتدار اتنا بڑھ گیا کہ انہوں نے مضمون نگاروں کے ساتھ ناشروں اور کتب فروشوں کو بھی لپیٹنا شروع کر دیا۔ مقدمات کے سلسلے میں منٹو کو ممبئی سے لاہور آنا پڑتا تھا۔ ادھر ہم بھی دلّی سے مُلزموں کی برات لے کر پہنچتے تھے۔ چند روز لاہور کے ادبی حلقوں میں خاصی چہل پہل رہتی۔ شاید ایک آدھ ہی افسانے میں جرمانہ قائم رہا۔ ورنہ اپیل میں سب بَری ہوتے رہے اور چودھری صاحب کلستے رہے۔ منٹو نے اپنے مقدمات کی رُوداد کسی کتاب کے دیباچے میں لکھی ہے اور اس کتاب کو چودھری صاحب ہی کے نام سے معنون کیا ہے۔

منٹو کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتی تھیں۔ انہیں ہمیشہ یہ احساس رہتا تھا کہ میں ہی سب سے اچھا لکھنے والا ہوں، اس لیے وہ اپنے آگے کسی کو گردانتے نہ تھے۔ ذرا کسی نے ڈون کی لی اور منٹو نے اڑنگا لگایا۔ خرابیِ صحت کی وجہ سے منٹو کی طبیعت کچھ چڑ چڑی ہو گئی تھی۔ مزاج میں سہار بالکل نہیں رہی تھی۔ بات بات پر اَڑنے اور لڑنے لگتے تھے۔ جو لوگ اُن کے مزاج کو سمجھ گئے تھے وہ اُن سے بات کرنے میں احتیاط برتا کرتے تھے۔ اُن کا مرض بقول اُن کے کسی ڈاکٹر سے تشخیص نہ ہو سکا۔ کوئی کہتا دِق ہے، کوئی کہتا معدے کی خرابی ہے، کوئی کہتا جگر کا فعل کم ہو گیا ہے اور ایک ستم ظریف نے کہا کہ تمہارا پیٹ چھوٹا ہے اور انتڑیاں بڑی ہیں۔ مگر منٹو ان سب بیماریوں سے بے پروا ہو کر ساری بد پرہیزیاں کرتا رہا۔

منٹو کی زبان پر ''فراڈ'' کا لفظ بہت چڑھا ہوا تھا، میرا جی کے ہاتھ میں دو لوہے کے گولے رہتے تھے، میں نے ان سے پوچھا، اِن کا مصرف کیا ہے؟ منٹو نے کہا ''فراڈ'' ہے۔ میرا جی نے سیویّوں کے مزعفر میں سالن ڈال کر کھانا شروع کر دیا، میں نے کہا ''یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟'' منٹو نے کہا ''فراڈ''۔ اوپندر ناتھ اشکؔ نے کوئی چیز لکھی، منٹو نے کہا ''فراڈ'' ہے۔ اُس نے کچھ چیں چیں کی تو کہا ''تو خود ایک فراڈ ہے۔''

یادش بخیر! ایک صاحب تھے دیوندر ستیارتھی، تھے کیا، اب بھی ہیں اور اُردو اور

ہندی کے بہت بڑے ادیب ہیں۔ لوک گیتوں پر انگریزی میں بھی ایک کتاب چھپوا چکے ہیں۔ اسی زمانے میں وہ دلّی آئے تو اُنہیں بھی افسانہ نگاری کا شوق چرایا۔ خاصے جہاں دیدہ آدمی تھے مگر باتیں بڑی بھولی بھالی کرتے تھے۔ بھاری بھرکم قد آور آدمی، چہرے پر بہت زبردست ڈاڑھی، دراصل انہوں نے اپنی وضع قطع ٹیگور سے ملانے کی کوشش کی تھی۔ ٹیگور کے ساتھ انہوں نے ایک تصویر بھی کھنچوائی تھی جس کے نیچے لکھا ہوا تھا ''گرو اور چیلا'' ایک طرف سفید بگلا استاد اور دوسری طرف کالا بھجنگ شاگرد۔

ہاں تو ستیارتھی صاحب نے افسانے لکھنے اور سنانے شروع کئے۔ ابتدا میں تو سب نے لحاظ مروّت میں چند افسانے سُنے پھر کنّی کاٹنے لگے۔ پھر انہیں دُور ہی سے دیکھ کر بھاگنے لگے۔ مگر منٹو بھاگنے والا آدمی نہیں تھا۔ منٹو نے ایک آدھ افسانہ تو سُنا۔ اس کے بعد ستیارتھی صاحب کو گالیوں پر دھرلیا۔ منٹو نے برملا کہنا شروع کردیا ''تو بہت بڑا فراڈ ہے، تیری ڈاڑھی ڈاڑھی نہیں ہے، پروپیگنڈا ہے، تُو افسانے ہم سے ٹھیک کراتا ہے اور جا کر اپنے نام سے چھپوالیتا ہے''۔ اور اس کے بعد مغلّظات سنانا شروع کردیں، مگر صاحب مجال ہے کہ ستیارتھی کی تیوری پر بل بھی آیا ہو! اُسی طرح مسکراتے اور بھولی بھالی باتیں کرتے رہے، میں کہتا تھا کہ اس شخص میں ولیوں کی سی صفات ہیں۔

منٹو کہتا تھا۔ ''یہ راسپوٹین ہے، ابلیس ہے!''

دراصل منٹو کو بناوٹ سے چڑ تھی، خود منٹو کا ظاہر و باطن ایک تھا، اس لیے لگی لپٹی نہ رکھتا تھا، جو کچھ کہنا ہوتا صاف کہہ دیتا، بلکہ منٹو بدتمیزی کی حد تک مُنہ پھٹ تھا۔

ایک دفعہ احمد شاہ بخاری نے بڑے سرپرستانہ انداز میں کہا۔ ''دیکھو منٹو، میں تمہیں اپنے بیٹے کے برابر سمجھتا ہوں۔''

منٹو نے جھلّا کر کہا ''مگر میں آپ کو اپنا باپ نہیں سمجھتا!''

مزہ تو اُس وقت آیا جب چراغ حسن حسرت سے منٹو کی ٹکّر ہوئی، واقعہ دلّی ریڈیو کا ہے جہاں اتفاق سے سبھی موجود تھے اور چائے کا دَور چل رہا تھا۔ حسرت اپنی علمیت کا

رعب سب پر گانٹھتے تھے۔ ذکر تھا سومرسٹ ماہم کا جو منٹو کا محبوب افسانہ نگار تھا اور مولانا جھٹ بات کاٹ کر اپنی عربی فارسی کو بیچ میں لے آئے اور لگے اپنے چڑاؤنے انداز میں کہنے ''مقاماتِ حریری میں لکھا، آپ نے تو کیا پڑھی ہوگی، عربی میں ہے یہ کتاب، دیوانِ حماسہ اگر آپ نے پڑھا ہوتا، مگر عربی آپ کو کہاں آتی ہے'' اور حسرت نے تابڑتوڑ کئی عربی فارسی کتابوں کے نام گنوا دیئے۔

منٹو خاموش بیٹھا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ بولا تو صرف اتنا بولا۔ ''مولانا ہم نے عربی فارسی اتنی نہیں پڑھی تو کیا ہے؟ ہم نے اور بہت کچھ پڑھا ہے۔''

بات شاید کچھ بڑھ جاتی مگر کرشن چندر وغیرہ نے بیچ میں پڑکر موضوع ہی بدل دیا۔ اگلے دن جب پھر سب جمع ہوئے تو حسرت کے آتے ہی بھونچال سا آ گیا۔ منٹو کا جوابی حملہ شروع ہوگیا۔ ''کیوں مولانا، آپ نے فلاں کتاب پڑھی ہے؟ مگر آپ نے کیا پڑھی ہوگی، وہ تو انگریزی میں ہے۔ اور فلاں کتاب؟ شاید آپ نے اس جدید ترین مصنف کا نام بھی نہیں سُنا ہوگا۔'' اور منٹو نے جتنے نام کتابوں کے لیے اُن میں سے شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو جس کا نام مشہور ہو۔ منٹو نے کوئی پچاس نام ایک ہی سانس میں گنوا دیئے اور مولانا سے کہلوالیا کہ اِن میں سے ایک بھی کتاب نہیں پڑھی۔ ہم چشموں اور ہم نشینوں میں یوں سُبکی ہوتے دیکھ کر مولانا کو پسینے آ گئے۔

منٹو نے کہا ''مولانا اگر آپ نے عربی فارسی پڑھی ہے تو ہم نے انگریزی پڑھی ہے، آپ میں کوئی سُرخاب کا پر لگا ہوا نہیں ہے۔ آئندہ ہم پر رعب جمانے کی کوشش نہ کیجئے۔''

مولانا کے جانے کے بعد کسی نے پوچھا ''یار تو نے یہ اتنے سارے نام کہاں سے یاد کر لیے؟''

منٹو نے مُسکرا کر کہا ''کل شام یہاں سے اُٹھ کر سیدھا انگریزی کتب فروش جینا کے ہاں گیا تھا، جدید ترین مطبوعات کی فہرست اُس سے لے کر میں نے رٹ ڈالی۔''

سُنا کہ اس بدمزگی کو یوں دُور کیا گیا کہ احباب نے رات کو ایک Cocktail پارٹی برپا کی۔ اور جب چند دَور ہو گئے تو منٹو اور حسرت کو گلے ملوا دیا۔

منٹو نے کہا۔ ''مولانا تم بھی فراڈ ہو اور میں بھی فراڈ ہوں۔''

حسرت نے کہا ''نہیں تم ماہم ہو۔''

منٹو نے کہا ''تم ابنِ خلدون ہو۔''

اور دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔

منٹو بڑا ذہین آدمی تھا۔ اگر ذرا کوئی اپنی حد سے بڑھتا تو وہ سمجھتا کہ یہ شخص میری توہین کر رہا ہے، مجھے احمق سمجھ رہا ہے۔ دل میں بات رکھنے کا وہ قائل نہیں تھا۔ اس کام کے لیے اوپندر ناتھ اشک بنا تھا۔ بڑی گھُٹل طبیعت کا آدمی تھا۔ منٹو مہینے میں تیس چالیس ڈرامے اور فیچر لکھ دیتا تھا، اور اشک صرف دو ڈرامے لکھتا تھا، اور وہ بھی رو رو کر۔ پھر بڑی ڈھٹائی سے کہتا پھرتا تھا کہ جتنی تنخواہ مجھے ملتی ہے اُس سے زیادہ کے یہ دو ڈرامے میں نے لکھے ہیں۔ منٹو اس کی بڑی دُرگت بناتا تھا۔ سب کے سامنے اسے فراڈ اور حرام زادہ تک کہہ دیتا تھا۔ اشک اُس وقت تو رُونکھا ہو جاتا لیکن منٹو کی باتیں دل میں رکھتا گیا اور بعد میں ممبئی کی فلم انڈسٹری میں منٹو کی جڑ کاٹتا پھرا۔

شیخی کی باتیں منٹو کو سخت ناپسند تھیں۔ اور شیخی کِرکری کرنے میں اُسے لطف آتا تھا۔ ن م۔ راشد سے میں نے کہا ''یہ آپ کی چھوٹی بڑی شاعری ہمیں تو اچھی نہیں لگتی۔ آخر اس میں کیا بات ہے؟''

راشد نے Rhyme اور Rythym پر ایک مختصر لیکچر جھاڑنے کے بعد اپنی نظم ''اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے'' مجھے سنانی شروع کی اور کہا ''دیکھئے! میں نے اس نظم میں ڈانس کا رِدھم رکھا ہے۔''

میں بڑی سعادت مندی سے سُنتا رہا مگر منٹو بھلا کب تاب لا سکتے تھے۔ چیخ کر بولے کونسا ڈانس؟ والز، رمبا، سمبا، کتھا کلی، کتھک، مَنی پوری؟..... فراڈ کہیں کا۔''

بچارے راشد کھسیانی ہنسی ہنس کر رہ گئے۔

منٹو کے دماغ میں نئی بات آتی تھی، ایسی اُپج کسی اور میں دیکھی ہی نہیں۔ ایک میم صاحب کی حسین ٹانگوں کو دیکھ کر کہنے لگے۔ ''مگر مجھے ایسی چار ٹانگیں مل جائیں تو انہیں کٹوا کر اپنے پلنگ کے پائے بنوالوں۔''

ریڈیو اسٹیشن پر منٹو ایک دن بڑے بیزار بیٹھے تھے میں نے کہا ''خیریت تو ہے؟'' بولے ''سخت بدتمیز اور جاہل ہیں یہاں کے لوگ، ٹیلی فون Receive کر کے کہتا ہوں ''منٹو'' اُدھر سے وہ حیران ہو کر پوچھتا ہے ''ون ٹو'' میں کہتا ہوں ''ون ٹو نہیں، منٹو'' تو وہ کہتا ہے ''بھنٹو؟''

منٹو کو اپنی زبان دانی پر بڑا ناز تھا، اور واقعی میں منٹو بہت صحیح اور عمدہ زبان لکھتے تھے، انہوں نے اپنے کسی افسانے میں ایک عورت کا حُلیہ لکھنے کے سلسلہ میں یہ بھی لکھا تھا کہ بچّہ ہونے کے بعد اُس کے پیٹ پر شکنیں پڑ گئی تھیں۔ میں نے شکنیں بدل کر چُرسیں کر دیا، جب افسانہ ساقی میں چھپ کر آیا تو منٹو اس لفظ پر اُچھل پڑے، بولے ''میں نے جس وقت شکنیں لکھا تھا تو میں سوچ رہا تھا کہ یہ لفظ ٹھیک نہیں ہے مگر میری سمجھ میں اور کوئی لفظ نہیں آیا، اصل لفظ یہی ہے کہ جو میں لکھنا چاہتا تھا''۔ اس کے بعد کھُلے دل سے انہوں نے سب کے سامنے کہا کہ ''میں صرف دو ایڈیٹروں کی اصلاح قبول کرتا ہوں، ایک آپ اور دوسرے حامد علی خاں، آپ دونوں کے علاوہ کسی اور کو میرا ایک لفظ بھی بدلنے کی اجازت نہیں ہے۔''

منٹو بظاہر بڑا اکھڑ اور بدتمیز آدمی نظر آتا تھا مگر دراصل اس کے پہلو میں ایک بڑا حساس دل تھا، دُنیا نے اسے بڑے دُکھ پہنچائے تھے۔ امیر گھرانے کا لاڈلا بچّہ تھا، بگڑ گیا اور خوب پیٹ بھر کے بگڑا۔ دوست احباب، کنبہ دار، رشتہ دار، سب سے اسے تکلیفیں پہنچی تھیں، اِس لیے اُس میں نفرت کا جذبہ بہت بڑھ گیا تھا، مگر اُس کی انسانیت مرتے دم تک قائم رہی، منٹو کا گل گوتھنا سا بچّہ اچھا خاصا کھیلتا مالتا ذرا سی بیماری میں چٹ پٹ ہو گیا۔ مجھے

معلوم ہوا تو میں بھی اس کے گھر پہنچا، احتیاطاً سو روپے ساتھ لیتا گیا کہ شاید منٹو کو روپے کی ضرورت ہو۔ صفیہ کا روتے روتے بُرا حال ہو گیا تھا۔ مَوتا کا گھر تھا، اس لیے میری بیوی کھانا لے کر پہنچیں، انہوں نے صفیہ کو سنبھالا منٹو کی آنکھوں میں پہلی اور آخری بار میں نے آنسو دیکھے، بچہ دفنایا جا چکا تھا، میں نے منٹو کو رسمی دِلاسا دِیا اور چپکے سے روپے اُن کی طرف بڑھا دیئے، منٹو نے روپے نہیں لیے مگر تھوڑی دیر کے لیے وہ اپنا غم بھول گیا اور حیرت سے میرا منہ تکتا رہا، بعد میں اس واقعہ کا تذکرہ اُس نے اکثر احباب سے کیا، اور متعجب ہوتا رہا کہ بے مانگے کوئی روپے کسی کو کیسے دے سکتا ہے۔

منٹو کو شراب پینے کی لت خدا جانے کب سے تھی، جب تک وہ دلّی میں رہے اُن کی شراب بڑھنے نہیں پائی تھی، ممبئی جانے کے بعد انہوں نے پیسہ بھی خوب کمایا اور شراب بھی خوب پی۔ جب پاکستان بنا تو وہ لاہور آ گئے۔ یہاں فلموں کا کام نہیں تھا، اس لیے انہیں قلم کا سہارا لینا پڑا۔ ہمارے ادب جیسی بنجر زمین سے روزی پیدا کرنا منٹو ہی کا کام تھا۔ صحت پہلے ہی کونسی اچھی تھی، رہی سہی شراب نے غارت کر دی۔ کئی دفعہ مرتے مرتے بچے، روٹی ملے یا نہ مِلے بیس روپے روز انہیں شراب کے لیے ملنے چاہئیں، اس کے لیے انہوں نے اچھا بُرا سب کچھ لکھ ڈالا، روزانہ دو ایک افسانے لکھنا ان کا معمول ہو گیا تھا، انہیں لے کر وہ کسی ناشر کے پاس پہنچ جاتے، ناشروں نے پہلے ضرورت سے انہیں خریدا، پھر بے ضرورت، پھر اُپرانے اور منہ چھپانے لگے دُور سے دیکھتے کہ منٹو آ رہا ہے تو دکان سے ٹل جاتے، منٹو کی اب بالکل وہی حالت ہو گئی تھی جو آخر آخر میں میں اختر شیرانی، اور میرا جی کی، بے تکلف لوگوں کی جیب میں ہاتھ ڈال دیتے اور جو کچھ جیب میں ہوتا نکال لیتے، اس میں سے گھر کچھ نہیں پہنچتا تھا، شراب سے بچانے کی بہت کوشش کی گئی۔ خود منٹو نے اس سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو پاگل خانے میں داخل کرا لیا۔ منہ سے یہ کافر لگی چھوٹ بھی گئی تھی مگر اللہ بھلا کرے دوستوں کا ایک دن پھر پلا لائے۔ نتیجہ یہ کہ رات کو خون کی قے ہوئی۔ ہسپتال پہنچایا گیا، مہینوں پڑے رہے اور جینے کا ایک موقع اور مل گیا۔

اگست ۱۹۵۴ء میں کئی سال بعد لاہور گیا تھا۔ لاہور کے ادیب، شاعر، ایڈیٹر اور پبلشر ایک بڑی پارٹی میں جمع تھے کہ غیر متوقع طور پر منٹو بھی وہاں آ گئے اور سیدھے میرے پاس چلے آئے، اُن کی حالت غیر تھی، میں نے کہا۔ "آپ تو بہت بیمار ہیں، آپ کیوں آئے؟ میں یہاں سے اُٹھ کر خود آپ کے پاس آنے والا تھا۔"

بولے "ہاں بیمار تو ہوں، مگر جب یہ سُنا کی آپ یہاں آرہے ہیں تو جی نہ مانا۔"

اتنے میں ایک شامت کا مارا پبلشر ادھر آ نکلا، منٹو نے آواز دی "اوے اِدھر آ" وہ رُکتا جھُکتا آ گیا "کیا ہے تیری جیب میں؟ نکال" اس نے جیب میں سے پانچ روپے نکال کر پیش کئے مگر منٹو پانچ روپے کب قبول کرنے والے تھے۔ "حرام زادے دس روپے تو دے" یہ کہہ کر اُس کی اندر کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا اور دس روپے کا نوٹ نکال کر پھر مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ گویا کچھ ہوا ہی نہیں، پبلشر نے بھی سوچا کہ چلو سستے چھوٹے، وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔ منٹو پندرہ بیس منٹ تک بیٹھے، باتیں کرتے رہے مگر اُن کی بے چینی بڑھ گئی اور عذر کر کے رخصت ہو گئے، مجھ سے ہمیشہ کے لیے رُخصت ہو گئے۔

پانچ مہینے بعد اخباروں سے معلوم ہوا کہ منٹو اس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ انہوں نے پھر چپکے سے شراب پی لی تھی، خون ڈالتے ڈالتے مر گئے، ہمیں تو منٹو کی عظمت کا اعتراف ہے ہی، خود منٹو کو بھی اس کا احساس تھا، چنانچہ جو کتبہ انہوں نے اپنی لوحِ مزار کے لیے خود لکھا تھا اُس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

"یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے، اُس کے سینے میں فنِ افسانہ نگاری کے سارے اسرار و رموز دفن ہیں وہ اب بھی منوں مٹی کے نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا خُدا؟"

☆☆☆

احمد ندیم قاسمی

سچا اور کھرا منٹو

میرے اور منٹو مرحوم کے تعلقات کی کہانی اٹھارہ برس پر پھیلی ہوئی ہے اور اس دوران میں منٹو نے اگر مجھے ایک سطر کا بھی خط لکھا ہے تو میں نے اسے محفوظ کر لیا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے، مجھے منٹو کی شخصیت سے بھی اور اس کے فن سے بھی عقیدت تھی اور ایک ادیب کے خطوط میں اس کی شخصیت اور اس کے فن کی جھلکیاں کچھ اس طرح یکجا ہو کر رہ جاتی ہیں کہ ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مجھے مجتبیٰ نصیر انور نے بتایا کہ جن دِنوں میں نے رسالہ 'سنگ میل' میں منٹو کے نام ایک کھلی چٹھی لکھی تھی تو منٹو نے اس چٹھی کو پڑھے بغیر ایک روز میرے ان خطوط کا بنڈل نکالا جو میں نے گذشتہ دس برس میں اسے لکھے تھے انہیں ایک ایک کر کے نذر آتش کر دیا۔

۱۹۳۷ء میں اختر شیرانی مرحوم کے توسط سے ہمارا تعارف ہوا اور چار برس کی خط و کتابت نے ہمارے درمیان خلوص کا ایک ایسا رشتہ قائم کر دیا جس کے بارے میں منٹو کو ۱۹۴۰ء تک یہ ڈر لگا رہا کہ اگر کہیں ہم دونوں کی ملاقات ہوگئی تو یہ رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ منٹو اس انداز سے کیوں سوچتا ہے، شاید میرے خطوط سے اس نے زندگی اور اخلاق سے متعلق میرے نظریات کا اندازہ لگا لیا ہو اور اسے محسوس ہوا ہو کہ ہم ایک ہی راہ پر تو کیا...... متوازی راہوں پر بھی نہیں چل سکیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ۱۹۵۰ء میں منٹو ممبئی سے دہلی آیا اور مجھے ملتان سے دہلی بلا بھیجا تو مجھے اس کے وہ تمام خطوط یاد آ گئے جس میں اس نے ہماری ملاقات کی خطرناکی کا خدشہ ظاہر کیا تھا۔ میں دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر اُترا اور تانگے والے کو اپنی منزل کا پتہ بتایا تو وہ مسکرانے لگا۔ میں سمجھا یہ شخص میری بڑی سی گھیرے دار شلوار اور میرے اس کوٹ کے نظارے سے محظوظ ہو رہا ہے جسے اگرچہ پتلون پر پہننے کے لیے تیار کیا گیا ہے لیکن جسے میں نے شلوار پر لٹکا رکھا ہے۔ ان دِنوں میری صحت پہلوانوں جیسی تھی اور کوچوان 'مخنچو' قسم کا آدمی تھا اس لیے میں نے سوچا ممکن ہے اس

جسمانی تقابل نے اس کے پھیپھڑوں میں ارتعاش پیدا کیا ہو، مگر کوچوان کی مسکراہٹ کا راز اس وقت کھلا جب ہم اپنی منزل کے قریب پہنچے۔

میں دہلی میں پہلی بار آیا تھا اس لیے کوچوان کے رحم وکرم پر تھا۔ پہلے تو مجھے کچھ احساس ہوا جیسے یہ کوچوان کوئی غنڈا ہے اور میرے اجنبی اجنبی تیوروں کی شہ پا کر اس بازار میں آ نکلا ہے جہاں ہر طرف ہارمونیم بج رہے ہیں۔ بکھرے بالوں اور لپ اسٹک سے تھپے ہوئے ہونٹوں کی چھاؤں چھا رہی ہے۔ خواتین کھڑکیوں اور دریچوں میں یوں بیٹھی ہیں جیسے نمبردار اپنی چوپال پر کبڈی کے کھلاڑی اپنے دوستوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں۔ یہاں سے وہاں تک کھلے جبڑوں کے تھکے ماندے قہقہے اور پان کی پیکیں اور مرجھائے ہوئے پھول بکھر رہے ہیں اور کوچوان کہہ رہا ہے۔ کیوں میاں؟ کیا آپ دلی میں پہلی بار آئے ہیں۔ اس کے کہنے پر میں نے پتہ پھر پڑھا اور میں حیران تھا کہ کیا پنڈت کرپارام کو رسالہ ''موویز'' کے دفتر کے لیے ساری دلی میں چاوڑی سے بہتر کوئی جگہ نہیں مل سکی؟ لیکن اب لوگوں سے اس دفتر کا پتہ پوچھتے ہوئے جھجک محسوس ہو رہی تھی، میں سوچتا تھا کہ اگر کسی نے یہ کہہ دیا کہ میاں یہاں رسالوں کے دفتر کہاں، یہاں تو دوسرے دفتر کھلے ہیں تو میں سوائے جھینپ جانے کے اور کیا کر سکوں گا، میں نے سوچا کھاری باؤلی میں رسالہ 'ساقی' کا دفتر ہے۔ وہیں چلتے ہیں مگر اچانک ''موویز'' کا بورڈ نظر آ گیا اور میں تانگے سے اُتر کر اندر چلا گیا۔

میں نے منٹو کو پہچان لیا، وہ ریلوے ٹائم ٹیبل میں سے اس گاڑی کا وقت دیکھ رہا تھا جس سے اُتر کر میں چاوڑی میں پہنچ چکا تھا۔ منٹو سے یہ میری پہلی ملاقات تھی، عام جسمانی صحت یونہی سی تھی مگر آنکھوں میں چمک اور رنگت میں سُنہرا پن تھا۔ شام کو ہم نئی دلی کے ایک الٹرا ماڈرن سنیما ہال کی چوتھی منزل پر بذریعہ لفٹ منتقل کر دئے گئے جہاں میں نے ایک مرہٹہ ادیب کھانڈیکر کی فلمی کہانی 'دھرم پتنی' کے مکالمے اور گیت لکھنا شروع کئے اور منٹو نے ان مکالموں اور گیتوں کو ٹائپ کرنے کا کام سنبھال لیا۔ دن بھر ہم یہ تخلیقی کام کرتے اور شام کو نیچے بازار میں چلے جاتے، منٹو شراب پیتا اور میں پوٹیٹو چپس کھاتا، دو تین دن کے بعد اس نے کہا یہ معاف کرنا احمد ندیم قاسمی، تم میری شراب کے مقابلے میں آلوؤں کی یہ کترنیں کھاتے ہوئے بھلے نہیں لگ رہے ہو اور دوسرے دن اس تنہائی کو ختم

کرنے کے لیے شاہد لطیف کو جو اُن دِنوں علی گڑھ یونیورسٹی میں ایم اے کے طالب علم تھے، دہلی بلا لیا اور ہم سنیما ہال کی چوتھی منزل پر دس بارہ روز تک مقیم رہے۔

میں اس دوران میں سوچتا رہا کہ آخر منٹو محض میری خاطر اتنی محنت کیوں کر رہا ہے، کہانی کھانڈ یکر کی ہے، مکالموں اور گیتوں کا معاوضہ مجھے ملے گا، مگر منٹو کیوں دن بھر بیٹھا درجنوں صفحے ٹائپ کر ڈالتا ہے بلکہ اکثر فلمی تکنیک کے سلسلے میں میری رہنمائی کرتا ہے اور بعض لمبے لمبے سین تو اس نے خود ہی لکھ کر ٹائپ کر ڈالے ہیں، یہ ٹھیک ہے کہ وہ میری مدد کرنا چاہتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مجھے بحیثیت سب انسپکٹر آبکاری صرف ساڑھے بہتر روپے ماہانہ ملتے ہیں مگر میں بھی تو یہ جانتا ہوں کہ منٹو ممبئی کے ہفت روزہ مصوّر کی ادارت کا حق الخدمت صرف پچاس روپئے ماہانہ کی صورت میں حاصل کرتا ہے، پھر وہ کون سا جذبہ ہے جس نے منٹو کو ممبئی سے دہلی لا کر اسے میری خاطر اندھا دھند مشقت پر مجبور کر دیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ جذبہ اس بے لوث خلوص کا تھا جو منٹو کی اور میری افتادِ طبع میں واحد قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا تھا، ایک دوسرے سے پیار اور ایک دوسرے کا احترام کرنے کے سوا ہم اپنی اپنی زندگی کی بیشتر سرگرمیوں میں ایک دوسرے کا ساتھ نہ دے سکے، طبائع کے اس واضح اختلاف کے باوجود ہمارے دوستانہ تعلقات ہمیشہ قائم رہے، ہمیں ایک دوسرے سے شکایتیں ضرور تھیں اور ان شکایتوں کا علی الاعلان اظہار بھی ہوتا رہا مگر ہم جب بھی ایک دوسرے سے ملے، میل دُھل گیا اور ہم آج سے سترہ اٹھارہ برس پہلے کے منٹو اور ندیم بن گئے۔

منٹو سے میری دوسری ملاقات اس سے اگلے سال ہوئی وہ ممبئی کو چھوڑ کر مستقل طور سے دہلی آ گیا تھا یہاں وہ آل انڈیا ریڈیو میں ملازم اور نکلس روڈ پرسن بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ ان دِنوں دہلی ریڈیو اسٹیشن میں اُردو کے بہت سے ادیب اور شاعر جمع تھے۔ مولانا چراغ حسن حسرت شاید نیوز سیکشن سے متعلق تھے ان کے علاوہ کرشن چندر، میراجی اوپند ناتھ اشک اور ن۔م۔راشد بھی موجود تھے۔ اردو شاعری کے نئے رجحانات کے نمائندہ شعرا کو ریڈیو والوں نے مدعو کیا تھا۔ تاثیر مرحوم اس محفل کے صدر تھے اور شرکائے محفل میں فیضؔ احمد فیضؔ، حفیظ جالندھریؔ، راشدؔ، میراجی، مجازؔ، تصدق حسین خالدؔ، سیماب مرحوم، روش صدیقی اور ساغر نظامی کے ناموں کے علاوہ اپنا

نام یاد رہ گیا ہے۔ منٹو کا فن ان دِنوں انتہائی عروج پر تھا۔ صحت بھی بری نہیں تھی۔ طبیعت میں شوخی اور بیبا کی تو ہمیشہ سے تھی لیکن ان دِنوں ان کی شخصیت کے یہ پہلو بھی اپنے عروج پر تھے ایک دن اچانک بولا، آؤ یار، ذرا حفیظؔ صاحب کو چھیڑیں، پھر وہ محفل میں حفیظ صاحب کے پاس گیا اور نہایت ادب سے بولا شاہنامہ اسلام کے ایک شعر کے سلسلے میں آپ سے استفادہ کرنا ہے۔ بہت گہرا شعر ہے۔ آپ نے فلسفے کا کوئی نکتہ نظم فرمایا ہے۔ میں نے ہزار سر مارا، پڑھے لکھے دوستوں سے بھی مشورہ لیا مگر وہ مجھے مطمئن نہیں کر سکے، آپ کا وہ شعر یہ ہے:

یہ لڑکا جو کہ بیٹھا ہے وہ لڑکی جو کہ بیٹھی ہے
یہ پیغمبر کا بیٹا ہے وہ پیغمبر کی بیٹی ہے

ساری محفل کشت زعفران بن گئی اور حفیظؔ صاحب بھی مسکرا کر ٹال گئے۔

پھر ایک دن منٹو نے مولانا چراغ حسن حسرتؔ کو چھیڑنے کا پروگرام بنایا، مولانا شاید میراجی کے کمرے میں تھے، کرشن، اشکؔ اور میں منٹو کے ہمراہ ان کے پاس پہنچے اور منٹو نے بیٹھتے ہی علامہ اقبال پر برسنا شروع کر دیا، بانگِ درا کے پہلے حصے سے آگے کے اقبال کو میں شاعر کے بجائے مولانا سمجھتا ہوں، آخر یہ بھی کوئی شاعری ہے کہ فلسفے کے نظریات کو بغیر کسی مقصد کے نظم کرتے جاؤ اور ہر نظریے کے کوٹ کے کالر میں خودی کا پھول سجاتے پھرو۔ پہلے تو مولانا حسرت صاحب نے اقبال کی حمایت میں چند نہایت ٹھوس باتیں کیں مگر انہیں منٹو کے تیوروں سے اس کی نیت کا جلد ہی پتہ چل گیا اور انہوں نے ایسی ایسی شگفتہ چٹکیاں لینا شروع کیں کہ منٹو کی تجویز کے مطابق ہم وہاں سے بچ بچ بھاگ آئے۔

میں چند روز منٹو ہی کے ہاں رُکا۔ منٹو کے گھر میں مجھے سلیقہ صفائی اور سادگی کا وہ معیار نظر آیا جو بڑے بڑے گھروں میں بھی محض ذوق لطیف کی کمی کے باعث غائب ہوتا ہے۔ منٹو کے لکھنے پڑھنے والے کمرے میں سفید چاندنی کا فرش بچھا رہتا، فٹ ڈیڑھ فٹ اونچے ڈیسک میں منٹو کے مسودے بند ہوتے، اتنی ہی بلند تپائی پر منٹو کا ٹائپ رائٹر رکھا رہتا، کتابیں نہایت سلیقے سے ایک لمبے شیلف میں سجی رہتیں اور گورا چٹا منٹو سفید براق لباس پہنے بیٹھا لکھتا اور ٹائپ کرتا نظر آتا، وہ اپنی شراب

کی بوتل کو بھی اسی ڈیسک کے نیچے چھپاتا تھا اس لیے کہ ان دِنوں منٹو کی بڑی بہن اس کے ہاں مقیم تھیں اور منٹو کہتا تھا کہ ''میں اپنی بہن سے ڈرتا ہوں اور پھر آج کل کے بچے اتنے تیز ہیں کہ انہیں ہزار سمجھایا جائے کہ اس بوتل میں تیل بھرا ہے وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے گھورے جائیں گے، سو ان سے بھی چھپانا پڑتا ہے۔ رہی صفیہ تو جب سے اس نے دیکھا ہے کہ میں چھوڑ نہیں سکتا تو اس نے ایک پیمانہ مقرر کر دیا ہے اور اس پیمانے سے میری سیری نہیں ہوتی، سو یہ فراڈ کرنا ہی پڑتا ہے۔''

منٹو کے مکان کی اس نہایت خوبصورت سادگی سے مجھے ۱۹۴۸ء کا ایک اور واقعہ یاد آ گیا ہے، منٹو میرے پاس آیا، ہم ڈرائینگ روم میں بیٹھے چند منٹ تک باتیں کرتے رہے کہ اچانک اس نے چونک کر کہا ''معلوم ہوتا ہے کہ اس کمرے میں تازہ تازہ سفیدی ہوئی ہے۔'' میں نے اسے بتایا کہ سفیدی کو بس ایک ہفتہ ہی گذرا ہوگا وہ بولا یہ تم شاعر ہو کر ایسی بھونڈی سفیدی کو برداشت کئے بیٹھے ہو۔'' میں نے اسے اطلاع دی کہ سفیدی خود میں نے کی ہے اس لیے عدم برداشت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر مجھے اپنے گھر لے گیا اور اپنے ڈرائینگ روم میں داخل ہو کر بولا۔ ''سفیدی اِسے کہتے ہیں۔''

تیسری مرتبہ خود منٹو نے مجھے بلا بھیجا۔ منٹو اور کرشن چندر نے بنجارا کے نام سے ایک فلمی کہانی لکھی تھی اور مجھے اس کے گیت لکھنا تھا۔ مجھے کوئی ایک مہینہ منٹو کے ہاں رہنے کا موقع ملا۔ اس دوران میں منٹو نے مجھ سے ریڈیو کے لیے ایک طویل اوپیرا اور چند منظوم ڈرامے بھی لکھوائے۔ اُجرت کے معاملہ میں ریڈیو کے حکام سے خوب لڑائیاں کیں، پھر جب مجھے خاصی معقول رقم دلوا چکا تو مجھے چاندنی چوک میں لے گیا وہاں اس نے ایک امرتسر دکاندار سے میرے لیے پتلون اور کوٹوں کے کپڑے خریدے، دو تین دِنوں میں میرا یہ لباس تیار ہو گیا اور یوں میں نے زندگی میں پہلی بار پتلون پہنی اور ٹائی لگائی۔

چوتھی ملاقات 'بُو' مقدمے کے سلسلے میں ہوئی، جب منٹو ممبئی میں تھا اور میں ادبِ لطیف لاہور کا ایڈیٹر تھا۔ پانچویں ملاقات انارکلی بازار میں محض اتفاق سے ہوئی جب میں ''سویرا'' کے خلاف ایک مقدمے کے سلسلے میں لاہور آیا ہوا تھا اور منٹو مستقل طور سے لاہور آ گیا تھا۔ چند روز کے

بعد وہ پشاور میں میرے پاس پہنچا اور وہاں پندرہ بیس روز رہا۔ ہمارے نظریاتی اختلاف کی ابتدا وہیں سے ہوئی۔

ہم دن بھر ریڈیو اسٹیشن میں گزارتے شام کو منٹو کسی نہ کسی شخص کو اپنے ساتھ لے آتا۔ اور پھر شراب کے دور چلتے۔ ادب میں حقیقت اور جنس پر بحثیں ہوتیں۔ منٹو کو ان تمام مقدمات پر عبور حاصل تھا جو دنیا کے بڑے بڑے ممالک میں مختلف ادیبوں پر عریانی کے الزام میں چلائے گئے۔ وہ ان مصنفین اور ان کی تحریروں کی مثالیں دیتا اور اس وقت اس کی زبان اتنی تیز ہو جاتی کہ اس پر ایک شعلہ نوا مقرر کا دھوکا ہوتا۔ ایک روز میں نے کہا'' ٹالسٹائی نے موپساں کے کسی افسانے میں لکھا ہے کہ اگر موپساں کو اپنی ننگی ہیروئن کو نہاتے ہوئے دکھانا تھا تو کیا اتنا کہہ دینا کافی نہیں تھا کہ وہ نہا رہی تھی۔ یا چلئے یہ بھی کہہ دیجئے کہ وہ نہا چکی تو اس کے جسم پر پانی کے بے شمار قطرے تھمے رہ گئے، لیکن موپساں کو یہ کہنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی کہ پانی کے ان قطروں کا رنگ ہیروئن کے جسم کی رنگت کی طرح ہلکا سنہری یا ہلکا گلابی تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے ادب میں لذتیت کی ابتدا ہوتی ہے۔'' یہ سن کر منٹو بھڑک اٹھا بولا۔'' تم کیا جانو عورت کے جسم کے راز۔ تم نے تو ابھی تک شادی نہیں کی، تم نے شراب تک نہیں چکھی، تم تو اس روز چاؤڑی میں یوں نظر آ رہے تھے جیسے راج ہنسوں کے ہجوم میں کوّا گھس آئے، تم کیا جانو موپساں نے قطروں کی رنگت کا اظہار کیوں ضروری سمجھا۔ اگر وہ رنگت کا ذکر نہ کرتا تو یہ عورت کیسی چپٹی چپٹی اور سپاٹ لگتی۔ ان گلابی قطروں ہی نے تو اسے زندگی دی ہے۔ تم کسانوں کی کہانیاں لکھ لیتے ہو۔ تو یہ ضروری نہیں کہ تم کسان عورتوں کی نفسیات کو بھی سمجھ سکو۔ عورت پر لکھتے وقت عورت بن جانا پڑتا ہے اور کبھی تم تخلیق کے لمحوں میں عورت بنے ہو؟ تمہیں کبھی کسی نے چھیڑا ہے؟ کبھی کسی اجنبی نے تمہارے جسم پر ہاتھ رکھا ہے؟ کوئی جھرجھری محسوس کی ہے؟ تمہارے اعصاب کبھی اس اجنبی لمس کی مضراب سے بھی جھنجھنائے ہیں؟ سو میری جان ٹالسٹائی کبھی کبھی اسی طرح گاندھی بنے پر اُتر آتا تھا۔ مگر کیا تمہارے خیال میں اس نے اپنی اینا کرینا کے ننگے پاؤں پر لکھتے ہوئے وہ کیفیت محسوس نہیں کی ہوگی جو موپساں نے اپنی ہیروئن کے جسم پر پانی کے گلابی قطرے دیکھنے میں محسوس کی؟ سو احمد ندیم قاسمی۔ بات یہ ہے کہ تم ادب کے وزیرِ خارجہ اور ہم ادب کے وزیرِ داخلہ

ہیں۔ ہماری اپنی اپنی راہیں اور اپنی اپنی منزلیں ہیں نہ ندیم منٹو بن سکتا ہے نہ منٹو ندیم۔ ٹالسٹائی ٹالسٹائی ہے اور موپساں موپساں ہے۔ اور میرے خیال میں میں نے ایک پیگ زیادہ چڑھالیا ہے، چلو اب سو جائیں۔"

ان دنوں میں نے تہیہ کرلیا کہ منٹو سے اس کے بعض افسانوں کے عریاں ٹکڑوں کی عریانی کی حقیقت تسلیم کرالوں۔ میں پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گیا اور آخر ایک روز منٹو ایسی تلخ کلامی پر اُتر آیا جس کا میں تصور تک نہیں کر سکتا تھا، پھر ایک روز میں نے اسے وہیں پشاور میں بہت زیادہ شراب پینے سے روکا تو وہ تنگ آ کر بولا "یہ میرا پرائیویٹ معاملہ ہے اور تم میرے دوست ضرور ہو مگر میں نے تمہیں اپنے ضمیر کی مسجد کا امام مقرر نہیں کیا۔"

دوسرے ہی دن اسے اپنے اس خوبصورت فقرے کی تلخی کا احساس ہو گیا کیونکہ اس کی باتوں اور تیوروں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھے منا رہا ہے، پھر یہاں لاہور میں جب ہمارے درمیان مہینوں تک کوئی ملاقات نہ ہوتی تھی وہ ایک دن میرے ہاں آیا مجھے اپنے گھر لے گیا اور اندھا دھند پی کر ۱۹۳۷ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک کی تمام باتوں کو اتنی تفصیل سے دہراتا رہا کہ میں اس کی بے پناہ یادداشت پر حیران رہ گیا۔ پھر وہ بولا "یہ باتیں نوٹ کرلو میری جان، شاید چند دنوں بعد تمہیں یہ باتیں مرحوم منٹو کی یاد میں لکھنا پڑیں۔" یہ سن کر میں خلاف معمول آپے سے باہر ہو گیا اور میں نے سوچے بغیر کہ منٹو نشے میں ہے کہنا شروع کیا "اگر آپ کو میری دوستی اتنی عزیز ہے تو پھر آپ کو شراب چھوڑنی پڑے گی۔ آپ تو پاگلوں کی طرح پیتے ہیں۔ کیا آپ کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ جس گھر میں آپ پی رہے ہیں اس میں نگہت بیٹی بھی رہتی ہے۔ یہ وہی بچی ہے جس کی ایک نہایت پیاری تصویر آپ نے بمبئی سے مجھے بھیجی تھی اور جو میرے پاس اب تک محفوظ ہے۔ آپ تو ادب کے وزیر داخلہ ہیں لیکن کیا آپ نگہت کے اس داخلی ردِّعمل کو ابھی سے محسوس نہیں کر سکتے جو چند برس کے بعد آپ کو اس کیفیت میں دکھ کر اس کے ذہن پر وارد ہوگا۔ اور اگر آپ کو اس بات کا احساس نہیں تو اب اپنے آپ کو ادب کا وزیر بے قلمدان کہا کیجئے کیونکہ جو ادیب صرف اپنے اندر بند رہتا ہے..... "اور منٹو نے کہا "اس فراڈ کی کوئی خاص ضرورت تو نہیں۔" اور اس کے بعد اس نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا کہ اس کی

ذات کے معمولات میں دخل دینے کا مجھے کوئی دور دراز کا بھی حق حاصل نہیں ہے۔ میں خفا ہوئے بغیر چلا آیا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ کل ہوش میں آ کر ان باتوں پر پچھتائے گا۔ مگر وہ نہیں پچھتایا بلکہ چند روز بعد سر راہے ملاقات ہوئی اور میں نے شکایت کی تو معلوم ہوا کہ اس روز جو کچھ اس نے کہا تھا وہ حرف آخر تھا اور وہ نشے کی نہیں، ہوش کی باتیں تھیں۔

تب میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس دوران میں گاہے بگاہے ملاقات ہوتی رہی مگر یہ حقیقت اپنی جگہ قائم رہی کہ نہ منٹو کو اپنی انتہا پسندیوں میں میری رفاقت گوارا ہے اور نہ مجھ میں اتنا حوصلہ ہے کہ اسے آہستہ آہستہ ختم ہوتے دیکھوں اور کچھ نہ بولوں۔ میں نے بول کر دیکھ لیا تھا۔

مگر اب مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے بزدلی دکھائی تھی، میں اس کا پہرہ دار بن کر کیوں نہ بیٹھ گیا، میں اس کی جھڑکیاں اور گالیاں تک سہتا مگر اسے زندہ رکھنے کی کوشش کرتا۔ اسی مہم میں اس کے گھرانے کے افراد اور اس کے چند نیک نفس دوست میرا ساتھ دیتے۔ اور ہم سب مل کر قوم کی اس متاع کو اتنی جلد نابود ہونے سے بچا لیتے اور منٹو نے ایک بار مجھے یہ بھی لکھا تھا کہ ''مجھے آپ کی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔'' سو اب دو ماتم میرے سپرد ہوئے ہیں، ایک منٹو کا اور دوسرا اپنی عزت نفس کے تحفظ کے ڈھونگ کا۔

آج میں منٹو کے چند خطوط ایک عظیم فنکار کی ایک نہایت پیاری یادگار کی صورت میں پیش کر رہا ہوں۔ منٹو کے کوئی ایک سو خط میرے پاس محفوظ ہیں۔ ان میں ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے منٹو کی نہایت سچی جھلکیاں جمع ہیں، میں انہیں کتابی صورت میں بھی چھاپنے کا ارادہ رکھتا ہوں (اور ان کے حقوق منٹو ہی کے نام محفوظ ہوں گے) مگر یہ سب خود فریبیاں اور جی بہلاوے ہیں۔ کیونکہ یہ ٹیس کسی وقت بھی میرے ضمیر سے نہیں نکل سکتی کہ میں نے اور میرے جیسے کتنے کم ہمت اور شکست خوردہ ''خیر خواہوں'' نے منٹو کو زندگی کے ویرانے میں یوں اکیلا چھوڑ دیا تھا کہ:

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

☆☆☆

اُلّو کا پٹھا

قاسم صبح سات بجے لحاف سے باہر نکلا اور غسل خانے کی طرف چلا۔ راستے میں، یہ اس کو ٹھیک طور پر معلوم نہیں، سونے والے کمرے میں، صحن میں یا غسل خانے کے اندر اُس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کسی کو اُلّو کا پٹھا کہے۔ بس صرف ایک بار، غصے میں یا طنزیہ انداز میں، کسی کو اُلّو کا پٹھا کہہ دے۔

قاسم کے دل میں اِس سے پہلے کئی بار بڑی بڑی انوکھی خواہشیں پیدا ہو چکی تھیں مگر یہ خواہش سب سے نرالی تھی۔ وہ بہت خوش تھا، رات اُس کو بڑی پیاری نیند آئی تھی، وہ خود کو بہت تر و تازہ محسوس کر رہا تھا لیکن پھر یہ خواہش کیسے اُس کے دل میں داخل ہو گئی۔ دانت صاف کرتے وقت اُس نے ضرورت سے زیادہ وقت صرف کیا جس کے باعث اس کے مسوڑھے چھل گئے۔ دراصل وہ سوچتا رہا کہ یہ عجیب و غریب خواہش کیوں پیدا ہوئی مگر وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔

بیوی سے وہ بہت خوش تھا۔ اُن میں کبھی لڑائی نہ ہوئی تھی۔ نوکروں پر بھی وہ ناراض نہیں تھا۔ اس لیے کہ غلام محمد اور نبی بخش دونوں خاموشی سے کام کرنے والے مستعد نوکر تھے، موسم بھی نہایت خوش گوار تھا، فروری کے سہانے دن تھے، جن میں کنوار پنے کی تازگی تھی، ہوا خنک اور ہلکی، دن چھوٹے نہ راتیں لمبی، نیچر کا توازن بالکل ٹھیک تھا اور قاسم کی صحت بھی خوب تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کسی کو بغیر وجہ کے الو کا پٹھا کہنے کی خواہش اُس کے دل میں کیوں کر پیدا ہو گئی۔

قاسم نے اپنی زندگی کے اٹھائیس برسوں میں متعدد لوگوں کو اُلّو کا پٹھا کہا ہو گا اور ممکن ہے کہ اِس سے بھی کڑوے لفظ اُس نے بعض موقعوں پر استعمال کیے ہوں اور گندی گالیاں بھی

دی ہوں مگر اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ ایسے موقعوں پر، خواہش بہت پہلے اُس کے دل میں پیدا نہیں ہوئی تھی مگر اب اچانک طور پر اُس نے محسوس کیا تھا کہ وہ کسی کو الو کا پٹھا کہنا چاہتا ہے اور یہ خواہش لحظہ بہ لحظہ شدت اختیار کرتی چلی گئی جیسے اُس نے اگر کسی کو الو کا پٹھا نہ کہا تو بہت بڑا ہرج ہو جائے گا۔

دانت صاف کرنے کے بعد اُس نے چھلے ہوئے مسوڑھوں کو اپنے کمرے میں جا کر آئینے میں دیکھا مگر دیر تک اُن کو دیکھتے رہنے سے بھی وہ خواہش نہ دبی جو ایکا ایکی اُس کے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔

قاسم منطقی قسم کا آدمی تھا۔ وہ بات کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کا عادی تھا۔ آئینہ میز پر رکھ کر وہ آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور ٹھنڈے دماغ سے سوچنے لگا:

''مان لیا کہ میرا کسی کو الو کا پٹھا کہنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر یہ کوئی بات تو نہ ہوئی۔ میں کسی کو الو کا پٹھا کیوں کہوں؟..... میں کسی سے ناراض بھی تو نہیں ہوں.....''

یہ سوچتے سوچتے اُس کی نظر سامنے دروازے کے بیچ میں رکھے ہوئے حقے پر پڑی۔ ایک دم اُس کے دل میں یہ باتیں پیدا ہوئیں، عجب واہیات نوکر ہے۔ دروازے کے عین بیچ میں یہ حقہ ٹکا دیا ہے۔ میں ابھی اس دروازے سے اندر آیا ہوں، اگر ٹھوکر سے بھری ہوئی چلم گر پڑتی تو، پا انداز جو کہ مونج کا بنا ہوا ہے، جلنا شروع ہو جاتا اور ساتھ ہی قالین بھی....

اُس کے جی میں آئی کہ غلام محمد کو آواز دے، جب وہ بھاگا ہوا اُس کے سامنے آ جائے تو وہ بھرے ہوئے حقے کی طرف اشارہ کر کے اس سے صرف اتنا کہے: ''تم بڑے اُلو کے پٹھے ہو۔'' مگر اس نے تامل کیا اور سوچا: ''یوں بگڑنا اچھا معلوم نہیں ہوتا، اگر غلام محمد کو اب بلا کر الو کا پٹھا کہہ بھی دیا تو وہ بات پیدا نہ ہوگی اور پھر.... اور پھر اس بے چارے کا کوئی قصور بھی تو نہیں ہے۔ میں دروازے کے پاس بیٹھ کر ہی تو ہر روز حقہ پیتا ہوں۔''

چنانچہ وہ خوشی جو ایک لمحے کے لیے قاسم کے دل میں پیدا ہوئی تھی کہ اُس نے اُلو کا پٹھا کہنے کے لیے ایک اچھا موقع تلاش کر لیا، غائب ہو گئی۔

دفتر کے وقت میں ابھی کافی دیر تھی۔ پورے دو گھنٹے پڑے تھے، دروازے کے پاس کرسی رکھ کر، قاسم اپنے معمول کے مطابق بیٹھ گیا اور حقہ نوشی میں مصروف ہو گیا۔

کچھ دیر تک وہ سوچ بچار کے بغیر حقے کا دھواں پیتا رہا اور دھویں کے انتشار کو دیکھتا رہا۔لیکن جوں ہی وہ حقے کو چھوڑ کر کپڑے تبدیل کرنے کے لیے ساتھ والے کمرے میں گیا تو اس کے دل میں وہی خواہش نئی تازگی کے ساتھ پیدا ہوئی۔

قاسم گھبرا گیا۔ بھئی حد ہو گئی ہے.... اُلو کا پٹھا..... میں کسی کو اُلو کا پٹھا کیوں کہوں اور بغرضِ محال میں نے کسی کو الو کا پٹھا کہہ بھی دیا تو کیا ہو گا۔

قاسم دل ہی دل میں ہنسا، وہ صحیح الدماغ آدمی تھا، اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ خواہش جو اُس کے دل میں پیدا ہوئی ہے بالکل بیہودہ اور بے سروپا ہے لیکن اس کا کیا علاج تھا کہ دبانے پر وہ اور بھی زیادہ اُبھر آئی تھی۔

قاسم اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ بغیر کسی وجہ کے اُلو کا پٹھا نہ کہے گا خواہ یہ خواہش صدیوں تک اس کے دل میں تلملاتی رہے۔ شاید اسی احساس کے باعث یہ خواہش جو بھٹکی ہوئی چمگادڑ کی طرح اُس کے روشن دل میں چلی آئی تھی، اس قدر تڑپ رہی تھی۔

پتلون کے بٹن بند کرتے وقت جب اس نے دماغی پریشانی کے باعث، اوپر کا بٹن نچلے کاج میں داخل کر دیا تو وہ جھلا اُٹھا ''بھئی ہوگا..... یہ کیا بیہودگی ہے۔ دیوانہ پن نہیں تو اور کیا ہے۔ الو کا پٹھا کہو۔ اُلو کا پٹھا کہو اور یہ پتلون کے سارے بٹن مجھے پھر سے بند کرنے پڑیں گے۔'' لباس پہن کر وہ میز پر آ بیٹھا۔ اس کی بیوی نے چائے بنا کر پیالی اس کے سامنے رکھ دی اور توس پر مکھن لگانا شروع کر دیا۔ روزانہ معمول کی طرح ہر چیز ٹھیک ٹھاک تھی، توس اتنے اچھے سنکے ہوئے تھے کہ بسکٹ کی طرح کرکرے تھے اور ڈبل روٹی بھی اعلیٰ قسم کی تھی، خمیر میں سے خوشبو آ رہی تھی، مکھن بھی صاف تھا، چائے کی کیتلی بے داغ تھی، اس کی مونٹھ کے ایک کونے پر قاسم ہر روز مَیل دیکھا کرتا تھا مگر آج وہ دھبّا بھی نہیں تھا۔

اس نے چائے کا ایک گھونٹ پیا، اس کی طبیعت خوش ہو گئی، دارجلنگ کی خالص

چائے تھی۔ جس کی مہک پانی میں بھی برقرار تھی، دودھ کی مقدار بھی صحیح تھی۔

قاسم نے خوش ہو کر اپنی بیوی سے کہا: ''آج چائے کا رنگ بہت ہی پیارا ہے اور بڑے سلیقے سے بنائی گئی ہے۔'' بیوی تعریف سن کر خوش ہوئی مگر اُس نے منہ بنا کر ایک ادا سے کہا ''جی ہاں، بس آج اتفاق سے اچھی بن گئی ہے ورنہ ہر روز تو آپ کو نیم گھول کے پلائی جاتی ہے۔ مجھے سلیقہ کہاں آتا ہے، سلیقے والیاں تو وہ موئی ہوٹل کی چھوکریاں ہیں جن کے آپ ہر وقت گُن گایا کرتے ہیں۔''

یہ تقریر سن کر قاسم کی طبیعت مکدر ہو گئی۔ ایک لمحے کے لیے اس کے جی میں آئی کہ چائے کی پیالی میز پر اُلٹ دے اور وہ نیم جو اس نے اپنے بچے کی پھنسیاں دھونے کے لیے غلام محمد سے منگوائی تھی اور سامنے بڑے طاقچے میں پڑی تھی گھول کر پی لے مگر اس نے بُردباری سے کام لیا ''یہ عورت میری بیوی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی بات بہت ہی بھونڈی ہے مگر ہندوستان میں سب لڑکیاں بیوی بن کر ایسی بھونڈی باتیں ہی کرتی ہیں اور بیوی بننے سے پہلے اپنے گھروں میں وہ اپنی ماؤں سے کیسی باتیں سنتی ہیں؟ بالکل ایسی ادنیٰ قسم کی باتیں اور اُس کی وجہ صرف یہ ہے کہ عورتوں کو عمومی زندگی میں اپنی حیثیت کی خبر ہی نہیں۔ میری بیوی تو پھر بھی غنیمت ہے یعنی صرف ایک ادا کے طور پر ایسی بھونڈی بات کہہ دیتی ہے، اس کی نیت نیک ہوتی ہے، بعض عورتوں کا تو یہ شعار ہوتا ہے کہ ہر وقت بکواس کرتی رہتی ہیں۔''

یہ سوچ کر قاسم نے اپنی نگاہیں اُس طاقچے پر سے ہٹا لیں جس میں نیم کے پتے دھوپ میں سوکھ رہے تھے اور بات کا رُخ بدل کر اُس نے مسکراتے ہوئے کہا: ''دیکھو، آج نیم کے پانی سے بچّے کی ٹانگیں ضرور دھو دینا۔ نیم زخموں کے لیے بڑی اچھی ہوتی ہے اور دیکھو، تم موسمبیوں کا رس ضرور پیا کرو، میں دفتر سے لوٹتے ہوئے ایک درجن اور لے آؤں گا یہ رس تمہاری صحت کے لیے ضروری ہے۔''

بیوی مسکرا دی۔ ''آپ کو تو بس ہر وقت میری ہی صحت کا خیال رہتا ہے، اچھی بھلی تو ہوں، کھاتی ہوں، پیتی ہوں، دوڑتی ہوں، بھاگتی ہوں، میں نے جو آپ کے لیے بادام

منگوا کے رکھے ہیں...... بھئی آج دس بیس آپ کی جیب میں ڈالے بغیر نہ رہوں گی، لیکن دفتر میں کہیں بانٹ نہ دیجیے گا۔'' قاسم خوش ہو گیا کہ چلو موسمبیوں کے رس اور باداموں نے اس کی بیوی کے مصنوعی غصے کو دور کر دیا اور یہ مرحلہ آسانی سے طے ہو گیا۔ دراصل قاسم ایسے مرحلوں کو آسانی کے ساتھ اُن طریقوں ہی سے طے کرتا تھا جو اس نے پڑوس کے پرانے شوہروں سے سیکھے تھے اور اپنے گھر کے ماحول کے مطابق، ان میں تھوڑا بہت ردوبدل کر لیا تھا۔ چائے سے فارغ ہو کر اُس نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور اُٹھ کر دفتر جانے کی تیاری کرنے ہی والا تھا کہ پھر وہی خواہش نمودار ہو گئی۔ اس مرتبہ اُس نے سوچا اگر میں کسی کو اُلو کا پٹھا کہہ دوں تو کیا ہرج ہے۔ زیرلب بالکل ہولے سے کہہ دوں، اُلو.... کا.... پٹھا۔ تو میرا خیال ہے کہ مجھے دلی تسکین ہو جائے گی۔ یہ خواہش میرے سینے میں بوجھ بن کر بیٹھ گئی ہے کیوں نہ اس کو ہلکا کر دوں۔ دفتر میں..... ''اُس کو صحن میں بچے کا کموڈ پڑا نظر آیا۔ یوں صحن میں کموڈ رکھنا سخت بدتمیزی تھی اور خصوصاً اس وقت جب کہ وہ ناشتہ کر چکا تھا اور خوشبودار کُرکُرے توس اور تلے ہوئے انڈوں کا ذائقہ ابھی تک اُس کے منہ میں تھا اُس نے زور سے آواز دی: ''غلام محمد!'' قاسم کی بیوی جو ابھی تک ناشتہ کر رہی تھی بولی ''غلام محمد باہر گوشت لینے گیا ہے۔ کوئی کام تھا آپ کو اس سے؟''

ایک سیکنڈ کے اندر اندر قاسم کے دماغ میں بہت سی باتیں آئیں: کہہ دوں، یہ غلام محمد اُلو کا پٹھا ہے۔ اور یہ کہہ کر جلدی سے باہر نکل جاؤں... نہیں.... وہ خود تو موجود ہی نہیں، پھر... بالکل بےکار ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ بچارے غلام محمد ہی کو کیوں نشانہ بنایا جائے۔ اس کو تو میں ہر وقت اُلو کا پٹھا کہہ سکتا ہوں.... '' قاسم نے ادھ جلا سگریٹ گرا دیا اور بیوی سے کہا: '' کچھ نہیں میں اس سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ دفتر میں میرا کھانا بے شک ڈیڑھ بجے لے آیا کرے۔ تمہیں کھانا جلدی بھیجنے میں بہت تکلیف کرنا پڑتی ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے بیوی کی طرف دیکھا۔ جو فرش پر اس کے گرائے ہوئے سگریٹ کو دیکھ رہی تھی۔ قاسم کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا: یہ سگریٹ اگر بجھ گیا اور یہاں پڑا رہا تو اس کا بچہ رینگتا رینگتا آئے گا اور اسے

اُٹھا کر منہ میں ڈل لے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے پیٹ میں گڑ بڑ مچ جائے گی۔ قاسم نے سگریٹ کا ٹکڑا اُٹھا کر غسل خانے کی موری میں پھینک دیا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر غلام محمد کو الو کا پٹھا نہیں کہہ دیا۔ اُس سے اگر ایک غلطی ہوئی ہے تو ابھی ابھی مجھ سے بھی تو ہوئی تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ میری غلطی زیادہ شدید تھی۔ قاسم بڑا صحیح الدماغ آدمی تھا۔ اسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ صحیح خطوط پر غور وفکر کرنے والا انسان ہے مگر اس احساس نے اس کے اندر برتری کا خیال کبھی پیدا نہیں کیا تھا۔ یہاں پر پھر اس کی صحیح الدماغی کو دخل تھا کہ وہ احساس برتری کو اپنے اندر دبا دیا کرتا تھا۔ موری میں سگریٹ کا ٹکڑا پھینکنے کے بعد اُس نے بلا ضرورت صحن میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ وہ دراصل کچھ دیر کے لیے بالکل خالی الذہن ہو گیا تھا۔ اس کی بیوی ناشتے کا آخری توس کھا چکی تھی۔ قاسم کو یوں ٹہلتے دیکھ کر وہ اس کے پاس آئی اور کہنے لگی: ''کیا سوچ رہے ہیں آپ۔'' قاسم چونک پڑا'' کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔ دفتر کا وقت ہو گیا کیا؟'' یہ لفظ اس کی زبان سے نکلے اور دماغ میں وہی اُلو کا پٹھا کہنے کی خواہش تڑپنے لگی۔

اس کے جی میں آئی کہ بیوی سے صاف صاف کہہ دے کہ یہ عجیب وغریب خواہش اس کے دل میں پیدا ہوگئی ہے جس کا سر ہے نہ پیر، بیوی ضرور سنے گی؟ (ہنسے گی) اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس کو بیوی کا ساتھ دینا پڑے گا۔ چنانچہ ہنسی ہنسی میں اُلو کا پٹھا کہنے کی خواہش اس کے دماغ سے نکل جائے گی۔ مگر اس نے غور کیا: اِس میں کوئی شک نہیں کہ بیوی ہنسے گی اور میں خود بھی ہنسوں گا لیکن ایسا نہ ہو کہ یہ بات مستقل مذاق بن جائے۔ ایسا ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کیا، ضرور ہو جائے گا اور بہت ممکن ہے کہ انجام کار ناخوشگواری پیدا ہو، چنانچہ اس نے اپنی بیوی سے کچھ نہ کہا اور ایک لمحے تک اس کی طرف یوں ہی دیکھتا رہا۔

بیوی نے بچے کا کموڈ اُٹھا کر کونے میں رکھ دیا اور کہا: ''آج صبح آپ کے برخوردار نے وہ ستایا ہے کہ اللہ کی پناہ۔ بڑی مشکلوں کے بعد میں نے اسے کموڈ پر بٹھایا اس کی مرضی یہ تھی کہ بستر ہی کو خراب کرے۔ آخر لڑکا کس کا ہے...؟

قاسم کو اس قسم کی چخ پسند تھی۔ ایسی باتوں میں وہ تیکھے مزاج کی جھلک دیکھتا تھا۔

مسکرا کر اس نے بیوی سے کہا: ''لڑکا میرا ہی ہے مگر، میں نے تو آج تک کبھی بستر خراب نہیں کیا۔ یہ عادت اس کی اپنی ہوگی۔'' بیوی نے اس کی بات کا مطلب نہ سمجھا۔ قاسم کو مطلقاً افسوس نہ ہوا، اس لیے کہ ایسی باتیں وہ صرف اپنے منہ کا ذائقہ درست رکھنے کے لیے کیا کرتا تھا وہ اور بھی خوش ہوا جب اس کی بیوی نے جواب نہ دیا اور خاموش ہوگئی۔ ''اچھا بھئی، میں اب چلتا ہوں، خدا حافظ!'' یہ لفظ جو ہر روز اُس کے منہ سے نکلتے تھے آج بھی اپنی پرانی آسانی کے ساتھ نکلے اور قاسم دروازہ کھول کر باہر چل دیا۔ کشمیری گیٹ سے نکل کر جب وہ نکلسن پارک کے پاس سے گزر رہا تھا تو اسے ایک داڑھی والا آدمی نظر آیا۔ ایک ہاتھ میں کھلی ہوئی شلوار تھامے وہ دوسرے ہاتھ سے استنجا کر رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر قاسم کے دل میں پھر الو کا پٹھا کہنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ''لو بھئی یہ آدمی ہے جس کو الو کا پٹھا کہہ دینا چاہیے۔ یعنی جو صحیح معنوں میں الو کا پٹھا ہے۔ ذرا انداز ملاحظہ کرو۔ کس انہماک سے ڈرائی کلین کیے جا رہا ہے۔ جیسے کوئی بہت اہم کام سرانجام پا رہا ہے۔ لعنت ہے۔''

لیکن قاسم صحیح الدماغ آدمی تھا۔ اس نے تعجیل سے کام نہ لیا اور تھوڑی دیر غور کیا ''میں اس فٹ پاتھ پر جا رہا ہوں اور وہ دوسرے فٹ پاتھ پر، اگر میں نے بلند آواز میں بھی اس کو اُلّو کا پٹھا کہا تو وہ چونکے گا نہیں۔ اس لیے کہ کم بخت اپنے کام میں بہت بری طرح مصروف ہے۔ چاہیے تو یہ کہ اُس کے کان کے پاس زور سے نعرہ بلند کیا جائے اور جب وہ چونک اُٹھے تو اسے بڑے شریفانہ طور پر سمجھایا جائے، قبلہ آپ اُلّو کے پٹھے ہیں۔ لیکن اس طرح بھی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔''

چنانچہ قاسم نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ اسی اثنا میں اُس کے پیچھے سے ایک سائیکل نمودار ہوئی۔ کالج کی ایک لڑکی اس پر سوار تھی۔ اس لیے کہ پیچھے بستہ بندھا تھا۔ آناً فاناً اس لڑکی کی ساڑی فری وہیل کے دانتوں میں پھنسی، لڑکی نے گھبرا کر اگلے پہیے کا بریک دبایا۔ ایک دم سائیکل بے قابو ہوئی اور ایک جھٹکے کے ساتھ لڑکی سائیکل سمیت سڑک پر گر پڑی۔

قاسم نے آگے بڑھ کر لڑکی کو اٹھانے میں عجلت سے کام نہ لیا۔ اس لیے کہ اس نے

حادثے کے ردِ عمل پر غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ لڑکی کی ساڑی فری وہیل کے دانتوں نے چبا ڈالی ہے اور اس کا بورڈر بہت بری طرح ان میں الجھ گیا ہے تو وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ لڑکی کی طرف دیکھے بغیر اس نے سائیکل کا پچھلا پہیا ذرا اونچا اُٹھایا تا کہ اسے گھما کر ساڑی کو فری وہیل کے دانتوں میں سے نکال لے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ پہیا گھمانے سے ساڑی کچھ اس طرح تاروں کی لپیٹ میں آئی کہ اُدھر پیٹی کوٹ کی گرفت سے باہر نکلی آئی۔ قاسم بوکھلا گیا۔ اس کی اس بوکھلاہٹ نے لڑکی کو بہت زیادہ پریشان کر دیا۔ زور سے اس نے ساڑی کو اپنی طرف کھینچا۔ فری وہیل کے دانتوں میں ایک ٹکڑا اڑا رہ گیا اور ساڑی باہر نکل آئی۔

لڑکی کا رنگ لال ہو گیا تھا۔ قاسم کی طرف اس نے غضب ناک نگاہوں سے دیکھا اور بھنچے ہوئے لہجے میں کہا: اُلّو کا پٹھا۔''

ممکن ہے کچھ دیر لگی ہو مگر قاسم نے ایسا محسوس کیا کہ لڑکی نے جھٹ پٹ اپنی ساڑی کو ٹھیک کیا اور ایک دم سائیکل پر سوار ہو کر یہ جا وہ جا، نظروں سے غائب ہو گئی۔

قاسم کو لڑکی کی گالی سن کر بہت دکھ ہوا۔ خاص کر اس لیے کہ وہ یہی گالی خود کسی کو دینا چاہتا تھا مگر وہ بہت صحیح الدماغ آدمی تھا۔ ٹھنڈے دل سے اس نے اس حادثے پر غور کیا اور اُس لڑکی کو معاف کر دیا۔ ''اس کو معاف ہی کرنا پڑے گا اس لیے کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں۔ عورتوں کو سمجھنا بہت مشکل کام ہے اور اُن عورتوں کو سمجھنا تو اور بھی مشکل ہو جاتا ہے جو سائیکل پر سے گری ہوئی ہوں لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اُس نے اپنی لمبی جراب میں اُوپر ران کے پاس تین چار کاغذ کیوں اُڑس رکھے تھے؟''

سعادت حسن منٹو

نیا قانون

منگو کوچوان اپنے اڈے میں بہت عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور نہ کبھی اس نے اسکول کا منہ ہی دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے، استاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب استاد منگو نے اپنی ایک سواری سے اسپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سنی تھی تو اس نے گاما چودھری کے چوڑے کاندھے پر تھپکی دے کر مدبرانہ انداز میں پیشین گوئی کی تھی ''دیکھ لینا چودھری، تھوڑے ہی دنوں میں اسپین کے اندر جنگ چھڑ جائے گی'' اور جب گاما چودھری نے اس سے پوچھا تھا کہ اسپین کہاں واقع ہے تو استاد منگو نے بڑی متانت سے جواب دیا تھا۔ ''ولایت میں اور کہاں''؟

اسپین میں جنگ چھڑی اور ایک شخص کو پتہ چل گیا تو اسٹیشن کے اڈے میں جتنے کوچوان حلقہ بنائے حقہ پی رہے تھے، دل ہی دل میں استاد منگو کی بڑائی کا اعتراف کر رہے تھے اور استاد منگو اس وقت مال روڈ کی چمکیلی سطح پر تانگہ چلاتے ہوئے اپنی سواری سے تازہ ہندو مسلم فساد پر تبادلۂ خیال کر رہا تھا۔ اس روز شام کے قریب جب وہ اڈے میں آیا تو اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتما رہا تھا۔ حقے کا دَور چلتے چلتے جب ہندو مسلم فساد کی بات چھڑی تو استاد منگو نے سر پر سے خاکی پگڑی اُتاری اور بغل میں داب کر بڑے متفکرانہ لہجے میں کہا:

''یہ کسی پیر کی بددعا کا نتیجہ ہے کہ آئے دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں چاقو چھریاں چلتے رہتے ہیں۔ میں نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ اکبر بادشاہ نے کسی درویش کا دِل دُکھایا تھا اور اس درویش نے جل کر یہ بددعا دی تھی۔ '' جا تیرے ہندوستان میں ہمیشہ فساد ہی ہوتے

رہیں گے‘‘ اور دیکھ جب سے اکبر بادشاہ کا راج ختم ہوا ہے ہندوستان میں فساد ہوتے رہتے ہیں۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور پھر حقے کا دم لگا کر اپنی بات شروع کی۔ ’’یہ کانگریسی ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ لوگ ہزار سال بھی سر پٹکتے رہیں تو کچھ نہ ہوگا۔ بڑی سے بڑی بات یہ ہوگی کہ انگریز چلا جائے گا اور کوئی اِٹلی والا آجائے گا، یا وہ رُوس والا، جس کی بابت میں نے سنا ہے کہ بہت تگڑا آدمی ہے لیکن ہندوستان سدا غلام رہے گا۔ ہاں یہ کہنا بھول ہی گیا کہ پیر نے یہ بددعا بھی دی تھی کہ ہندوستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی ہی راج کرتے رہیں گے‘‘۔

استاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ اس کے ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں۔ مگر اس کے تنفر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اُسے بہت ستایا کرتے تھے، وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے گویا وہ ایک ذلیل کتا ہے، اس کے علاوہ اسے ان کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا۔ جب کبھی وہ گورے کے سُرخ سپید چہرے کو دیکھتا تو اُسے متلی سی آجاتی تھی، نہ معلوم کیوں؟ وہ کہا کرتا تھا کہ ان کے لال جھریاں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے جس کے جسم پر سے اُوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو۔ جب کسی شرابی گورے سے اس کا جھگڑا ہو جاتا تو سارا دن اس کی طبیعت مکدر رہتی اور وہ شام کو اڈے میں آکر ہل مارکر سگریٹ پیتے یا حقے کے کش لگاتے ہوئے اس گورے کو جی بھر کے سنایا کرتا۔

’’........‘‘ یہ موٹی گالی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ڈھیلی پگڑی سمیت جھٹکا دے کر کہا کرتا تھا ’’آگ لینے آئے تھے، اب گھر کے مالک ہی بن گئے، ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے یوں رعب گانٹھتے ہیں گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں....‘‘

اس پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا، جب تک اس کا کوئی ساتھی اس کے پاس بیٹھا رہتا وہ اپنے سینے کی آگ اُگلتا رہتا۔ ’’شکل دیکھتے ہو نا تم اس کی.... جیسے کوڑھ ہو رہا ہو بالکل مُردار، ایک دھپے کی مار اور گٹ پٹ گٹ پٹ یوں بک رہا تھا جیسے مار ہی ڈالے گا۔ پہلے

پہلی جی میں آئی کہ ملاعون کی کھوپڑی کے پُرزے اُڑادوں لیکن اس خیال سے ٹل گیا کہ اس مردود کو مارنا اپنی ہتک ہے''...... یہ کہتے کہتے وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوجاتا اور ناک کو خاکی قمیض کی آستین سے صاف کرنے کے بعد پھر بڑبڑانے لگ جاتا۔

''قسم ہے بھگوان کی، ان لاٹ صاحبوں کے ناز اٹھاتے تنگ آ گیا ہوں، جب کبھی ان کا منحوس چہرہ دیکھتا ہوں رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے۔ تیری قسم جان میں جان آئے۔''

اور جب ایک روز استاد منگو نے کچہری سے اپنے تانگے پر دو سواریاں لادیں اور ان کی گفتگو سے اسے پتہ چلا کہ ہندوستان میں جدید آئین کا نفاذ ہونے والا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ دو مارواڑی جو کچہری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے گھر جاتے ہوئے جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے متعلق دونوں بات چیت کر رہے تھے۔''سنا ہے کہ پہلی اپریل سے ہندستان میں نیا قانون چلے گا، کیا ہر چیز بدل جائے گی؟''------ ہر چیز تو نہیں بدلے گی مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا اور ہندوستانیوں کو آزادی مل جائے گی۔ ''کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟''، ''یہ پوچھنے کی بات ہے کل کسی وکیل سے دریافت کریں گے۔'' ان مارواڑیوں کی بات چیت استاد منگو کے دل میں ناقابل بیان خوشی پیدا کر رہی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو ہمیشہ گالیاں دیتا تھا اور چابک سے بہت بُری طرح سے پیٹا کرتا تھا مگر وہ بار بار پیچھے مُڑ کر مارواڑیوں کی طرف دیکھتا اور اپنی بڑھی ہوئی مونچھوں کے بال ایک انگلی سے بڑی صفائی کے ساتھ اونچے کر کے گھوڑے کی پیٹھ پر باگیں ڈھیلی کرتے ہوئے بڑے پیار سے کہتا'' چل بیٹا، چل، ذرا ہوا سے باتیں کر کے دکھادے''۔ مارواڑیوں کو اُن کے ٹھکانے پر پہنچا کر اس نے انارکلی میں دینو حلوائی کی دکان پر آدھ سیر دہی کی لسی پی کر ایک بڑی ڈکار لی اور مونچھوں کو منہ میں دبا کر ان کو چوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا'' ہت تیری ایسی کی تیسی۔''

شام کو جب وہ اڈے کو لوٹا تو خلافِ معمول اسے وہاں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی

نہ مل سکا، یہ دیکھ کر اس کے سینے میں ایک عجیب وغریب طوفان برپا ہو گیا۔ آج وہ ایک بڑی خبر اپنے دوستوں کو سنانے والا تھا۔ بہت بڑی خبر، اور اس خبر کو اپنے اندر سے باہر نکالنے کے لیے وہ سخت مجبور ہو رہا تھا۔ آدھ گھنٹے تک وہ چابک بغل میں دبائے اسٹیشن کے اڈے کی آہنی چھت کے نیچے بیقراری کی حالت میں ٹہلتا رہا۔ اس کے دماغ میں بڑے اچھے اچھے خیالات آ رہے تھے۔ نئے قانون کے نفاذ کی خبر نے اس کو ایک نئی دنیا میں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اس نئے قانون کے متعلق جو یکم اپریل کو ہندوستان میں نافذ ہونے والا تھا اپنے دماغ کی تمام بتیاں روشن کر کے غور وفکر کر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں مارواڑی کا یہ اندیشہ ''کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا'' بار بار گونج رہا تھا اور اس کے تمام جسم میں مسرت کی ایک لہر دوڑ رہا تھا۔ کئی بار اپنی گھنی مونچھوں کے اندر ہنس کر اس نے ان مارواڑیوں کو گالی...... غریبوں کی کھٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل..... نیا قانون ان کے لیے کھولتا ہوا پانی ہوگا۔''

وہ بے حد مسرور تھا، خاص کر اس وقت اُس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہنچتی جب وہ خیال کرتا کہ گوروں، سفید چوہوں (وہ ان کو اسی نام سے یاد کرتا تھا) کی تھوتھنیاں نئے قانون کے آتے ہی بلوں میں ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائیں گی۔ جب نتھو گنجا پگڑی بغل میں دبائے اڈّے میں داخل ہوا تو استاد منگو بڑھ کر اس سے ملا اور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے کہنے لگا ''لا ہاتھ ادھر.... ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے... تیری اس گنجی کھوپڑی پر بال اُگ آئیں''۔ اور یہ کہہ کر منگو نے بڑے.... مزے لے لے کر نئے قانون کے متعلق اپنے دوست سے باتیں شروع کر دیں۔ دوران گفتگو میں اس نے کئی مرتبہ نتھو گنجے کے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر کہا ''تُو دیکھتا رہ! کیا بنتا ہے۔ یہ روس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ ضرور کر کے رہے گا۔'' استاد منگو موجودہ سوویت نظام کی اشتراکی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا اور اسے وہاں کے نئے قانون اور دوسری نئی چیزیں بہت پسند تھیں۔ اس لیے اس نے ''روس والے بادشاہ کو انڈیا ایکٹ یعنی جدید آئین کے ساتھ ملا دیا۔ اور پہلی اپریل کو پُرانے نظام میں جو نئی تبدیلیاں ہونے والی تھیں وہ انہیں 'روس والے بادشاہ' کے اثر کا نتیجہ سمجھتا

تھا۔ کچھ عرصے سے پشاور اور دیگر شہروں میں سرخ پوشوں کی تحریک جاری تھی، استاد منگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں 'روس والے بادشاہ' اور پھر نئے قانون کے ساتھ خلط ملط کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے سنتا کہ فلاں شہر میں اتنے بم ساز پکڑے گئے ہیں یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے تو ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا تھا اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا تھا۔

ایک روز اس کے تانگے میں دو بیرسٹر بیٹھے، نئے آئین پر بڑے زور سے تنقید کر رہے تھے اور وہ خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ان میں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا۔ ''جدید آئین کا دوسرا حصہ فیڈ ریشن ہے جو میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا۔ ایسا فیڈ ریشن دنیا کی تاریخ میں آج تک سنا نہ دیکھا گیا ہے۔ سیاسی نظریہ کے اعتبار سے بھی فیڈ ریشن بالکل غلط ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ کوئی فیڈ ریشن ہے ہی نہیں۔''

ان بیرسٹروں کے درمیان جو گفتگو پیدا ہوئی چونکہ ان میں بیشتر الفاظ انگریزی کے تھے اس لیے استاد منگو صرف اوپر کے جملے ہی کو کسی قدر سمجھا۔ اور اس نے خیال کیا کہ یہ لوگ ہندوستان میں نئے قانون کی آمد کو بُرا سمجھتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ ان کا وطن آزاد ہو، چنانچہ اس خیال کے زیرِ اثر اس نے کئی مرتبہ ان دو بیرسٹروں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھ کر دل ہی دل میں کہا ''ٹوڈی بچے''۔

جب کبھی وہ کسی دبی زبان میں ''ٹوڈی بچہ'' کہتا تو دل میں یہ محسوس کر کے بڑا خوش ہوتا تھا کہ اس نے اس نام کو صحیح جگہ استعمال کیا ہے اور یہ کہ وہ شریف آدمی اور ''ٹوڈی بچے'' میں تمیز کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اس واقعے کے تیسرے روز وہ گورنمنٹ کالج کے تین طلبہ کو اپنے تانگے میں بٹھا کر مزنگ جا رہا تھا کہ اس نے ان تین لڑکوں کو آپس میں یہ باتیں کرتے سُنا ''نئے آئین نے میری امیدیں بڑھا دی ہیں اگر..... صاحب اسمبلی کے ممبر ہو گئے تو کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائے گی۔'' ویسے بھی بہت سی جگہیں اور نکلیں گی، شاید اسی گڑبڑ میں ہمارے ہاتھ بھی کچھ آ جائے۔'' ہاں، ہاں کیوں نہیں، وہ بے کار گریجویٹ جو مارے

مارے پھر رہے ہیں ان میں کچھ تو کمی ہوگی۔"

اس گفتگو نے منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور بھی بڑھادی اور وہ اس کو ایسی 'چیز' سمجھنے لگا جو بہت چمکتی ہو۔ 'نیا قانون' وہ دن میں کئی بار سوچتا یعنی کوئی نئی چیز اس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ نیا ساز آجاتا تو جو اس نے دو برس ہوئے چودھری خدا بخش سے بڑی اچھی طرح ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔ اس ساز پر جب وہ نیا تھا جگہ جگہ لوہے کی نِکل چڑھی ہوئی کیلیں چمکتی تھیں اور جہاں جہاں پیتل کا کام تھا وہ تو سونے کی طرح دمکتا تھا اس لحاظ سے بھی 'نئے قانون' کا درخشاں و تاباں ہونا ضروری تھا۔

پہلی اپریل تک استاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اس کے حق میں بہت کچھ سنا مگر اس کے متعلق جو تصور وہ اپنے ذہن میں قائم کر چکا تھا بدل نہ سکا، وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا اور اس کو یقین تھا کہ اس کی آمد پر جو چیزیں نظر آئیں گی ان سے اس کی آنکھوں کو ضرور ٹھنڈک پہنچے گی۔ آخر کار مارچ کے اِکتیس دن ختم ہو گئے اور اپریل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے ۔موسم خلاف معمول سرد تھا۔ اور ہوا میں تازگی تھی۔ پہلی اپریل کو صبح سویرے استاد منگو اُٹھا اور اصطبل میں جا کر تانگے میں گھوڑے کو جوتا اور باہر نکل گیا۔ اس کی طبیعت آج غیر معمولی طور پر مسرور تھی وہ نئے قانون کو دیکھنے والا تھا۔

اس نے صبح کے سرد دھند لکے میں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا چکر لگایا مگر اسے ہر چیز پُرانی نظر آئی۔ آسمان کی طرح پرانی، اس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیا رنگ دیکھنا چاہتی تھیں، مگر سوائے اس کلغی کے رنگ برنگ کے پروں سے بنی تھی اور گھوڑے کے سر پر جمی ہوئی تھی اور سب چیزیں پُرانی نظر آرہی تھیں۔ یہ نئی کلغی اس نے نئے قانون کی خوشی میں ۳۱ر مارچ کو چودھری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنے میں خریدی تھی۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز، کالی سڑک اور اس کے آس پاس تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لگائے ہوئے بجلی کے کھمبے، دکانوں کے بورڈ، اس کے گھوڑے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگھروں کی جھنجھناہٹ، بازار میں چلتے

پھرتے آدمی، ان میں سے کون سی چیز نئی تھی؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں لیکن استاد منگو مایوس نہیں تھا۔

ابھی بہت سویرا ہے دکانیں بھی تو سب بند ہیں، اس خیال سے اسے تسکین تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا۔ ''ہائی کورٹ میں نو بجے کے بعد ہی کام شروع ہوتا ہے۔ اب اس سے پہلے نیا قانون کیا نظر آئے گا۔'' جب اس کا تانگہ گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہنچا تو کالج کے گھڑیال نے بڑی رعونت سے نو بجائے۔ جو طلبہ کالج کے بڑے دروازے سے باہر نکل رہے تھے خوش پوش تھے مگر استاد منگو کو نہ جانے ان کے کپڑے میلے میلے سے کیوں نظر آئے۔ شاید اُس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کن جلوے کا نظارہ کرنے والی تھیں۔ تانگے کو دائیں ہاتھ موڑ کر وہ تھوڑی دیر کے بعد پھر انارکلی میں تھا۔ بازار کی آدھی دکانیں کھل چکی تھیں اور اب لوگوں کی آمد و رفت بھی بڑھ گئی تھی۔ حلوائی دکانوں پر گاہکوں کی خوب بھیڑ تھی۔ منہاری والوں کی نمائشی چیزیں شیشے کی الماریوں میں لوگوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں اور بجلی کے تاروں پر کئی کبوتر آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے مگر استاد منگو کے لیے ان تمام چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ نئے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

جب استاد منگو کے گھر میں بچہ پیدا ہونے والا تھا تو اس نے چار پانچ مہینے بڑی بیقراری سے گزارے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ بچہ کسی نہ کسی دن ضرور پیدا ہوگا۔ مگر وہ انتظار کی گھڑیاں نہیں کاٹ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے بچے کو صرف ایک نظر دیکھ لے اس کے بعد وہ پیدا ہوتا رہے۔ چنانچہ اس غیر مغلوب خواہش کے زیرِ اثر اس نے کئی مرتبہ اپنی بیمار بیوی کے پیٹ کو دبا دبا کر اور اس کے اوپر کان رکھ رکھ کر اپنے بچے کے متعلق کچھ جاننا چاہتا تھا۔ مگر ناکام رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ انتظار کرتے کرتے اس قدر تنگ آ گیا کہ وہ اپنی بیوی پر برس بھی پڑا تھا۔

''تو ہر وقت مُردے کی طرح پڑی رہتی ہے۔ اُٹھ، ذرا چل پھر، تیرے انگ میں تھوڑی سی طاقت تو آئے، یوں تختہ بنے رہنے سے کچھ نہ ہو سکے گا، تو سمجھتی ہے کہ اس طرح لیٹے لیٹے بچہ

جن دے گی''۔

استاد منگو طبعاً بہت جلد باز واقع ہوا تھا، وہ ہر سبب کی عملی تشکیل دیکھنے کا نہ صرف خواہش مند تھا بلکہ متجسّس تھا۔ اس کی بیوی گنگاوتی اس کی اس قسم کی بے قراریوں کو دیکھ کر عام طور پر کہا کرتی تھی۔''ابھی کنواں کھودا نہیں گیا اور تم پیاس سے بے حال ہو رہے ہو۔'' کچھ بھی ہو مگر استاد منگو نئے قانون کے انتظار میں اتنا بے قرار نہیں تھا جتنا کہ وہ اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہتا تھا۔ وہ آج نئے قانون کو دیکھنے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے وہ گاندھی یا جواہر لال کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لیے نکلتا تھا۔

لیڈروں کی عظمت کا اندازہ استاد منگو ہمیشہ ان کے جلوس کے ہنگاموں اور ان کے گلے میں ڈالے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے کیا کرتا تھا۔ اگر کوئی لیڈر گیندے کے پھولوں سے لدا ہو تو استاد منگو کے نزدیک وہ بڑا آدمی تھا اور اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بھیڑ کے باعث دو تین فساد ہوتے ہوتے رہ جائیں تو اس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا۔ اب نئے قانون کو وہ ذہن کے اس ترازو میں تولنا چاہتا تھا۔ انارکلی سے نکل کر وہ مال روڈ کی چمکیلی سطح پر اپنے تانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا کہ موٹروں کی دکان کے پاس اسے چھاؤنی کی ایک سواری مل گئی۔ کرایہ طے کرنے کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا اور دل میں خیال کیا''چلو یہ بھی اچھا ہوا شاید چھاؤنی ہی سے نئے قانون کا کچھ پتہ چل جائے''۔

چھاؤنی پہنچ کر استاد منگو نے سواری کو اس کے منزل مقصود پر اُتار دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں دبا کر سُلگایا اور اگلی نشست کے گدّے پر بیٹھ گیا جب استاد منگو کو کسی سواری کی تلاش نہیں ہوتی تھی یا اسے کسی بیتے ہوئے واقعے پر غور کرنا ہوتا تھا تو وہ عام طور پر اگلی نشست چھوڑ کر پچھلی نشست پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اپنے گھوڑے کی باگیں دائیں ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا گھوڑا تھوڑا سا ہنہنانے کے بعد بڑی دھیمی چال سے چلنا شروع کر دیتا تھا، گویا اسے تھوڑی دیر کے لیے بھاگ دوڑ سے چھٹی مل گئی ہے۔ گھوڑے کی چال اور استاد منگو کے دماغ میں خیالات کی آمد بہت سست تھی،

جس طرح گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا اسی طرح استاد منگو کے ذہن میں نئے قانون کے متعلق نئے قیاسات داخل ہو رہے تھے۔

وہ نئے قانون کی موجودگی میں میونسپل کمیٹی سے تانگوں کے نمبر ملنے کے طریقے پر غور کر رہا تھا اور اس قابلِ غور بات کو آئین جدید کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ وہ اس سوچ وچار میں تھا کہ اسے یوں معلوم ہوا جیسے کسی سواری نے اسے بلایا ہے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے اسے سڑک کے اس طرف دور بجلی کے کھمبے کے پاس ایک "گورا" کھڑا نظر آیا جو اسے ہاتھ سے بلا رہا تھا۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، استاد منگو کو گوروں سے بے حد نفرت تھی، جب اس نے اپنے تازہ گاہک کو گورے کی شکل میں دیکھا تو اس کے دل میں نفرت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ پہلے تو اس کے جی میں آیا کہ بالکل توجہ نہ دے اور اس کو چھوڑ کر چلا جائے مگر بعد میں اس کو خیال آیا ..... "ان کے پیسے چھوڑنا بھی بے وقوفی ہے۔ کلغی پر جو مفت میں ساڑھے چودہ آنے خرچ کر دیئے ہیں ان کی جیب ہی سے وصول کرنی چاہئیے۔ چلو چلتے ہیں۔"

خالی سڑک پر بڑی صفائی سے تانگہ موڑ کر اس نے گھوڑے کو چابک دکھایا اور پلک جھپکنے کی دیر میں وہ بجلی کے کھمبے کے پاس تھا، گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ ٹھہرایا اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا۔ "صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے"۔

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھنچ گیا۔ اور پاس ہی کے گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر، ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی، گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھاری ڈال دی ہے۔ اس کا سارا چہرہ ہنس رہا تھا اور اپنے اندر اس نے اس 'گورے' کو سینے کی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔ جب 'گورے' نے جو بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہوا کا رُخ بچا کر سگریٹ سلگا رہا تھا مڑ کے پائدان کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک استاد منگو کی اور اس کی نگاہیں چار ہوئیں اور ایسا معلوم ہوا کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں سے گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولا بن کر اوپر کو اُڑ گئیں۔

استاد منگو جو اپنے دائیں ہاتھ سے باگ کے بل کھول کر تانگے پر سے نیچے اترنے والا تھا اپنے سامنے کھڑے گورے کو یوں دیکھ رہا تھا گویا وہ اس کے وجود کے ذرّے ذرّے کو اپنی نگاہوں سے چبا رہا ہے اور گورا کچھ اس طرح اپنی نیلی پتلون پر سے غیر مرئی چیزیں جھاڑ رہا تھا گویا وہ استاد منگو کے اس حملے سے اپنے وجود کے کچھ حصّے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

گورے نے سگریٹ کا دھواں نگلتے ہوئے کہا ''جانا مانگتا ہے یا پھر گڑ بڑ کرے گا۔'' وہی ہے'' یہ لفظ استاد منگو کے ذہن میں پیدا ہوئے اور اس کی چوڑی چھاتی کے اندر ناچنے لگے۔ ''وہی ہے'' اس نے یہ لفظ اپنے منہ کے اندر ہی اندر دہرائے اور ساتھ ہی اسے پورا یقین ہو گیا کہ وہ گورا جو اس کے سامنے کھڑا تھا وہی ہے جس سے پچھلے برس اس کی جھڑپ ہوئی تھی اور اس خواہ مخواہ کے جھگڑے میں جس کا باعث گورے کے دماغ میں چڑھی ہوئی شراب تھی اسے طوعاً و کرہاً بہت سی باتیں سہنا پڑی تھیں۔ استاد منگو نے گورے کا دماغ درست کر دیا ہوتا بلکہ اس کے پرزے اُڑا دیئے ہوتے مگر وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہو گیا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا نزلہ عام طور پر کوچوان ہی پر گرتا ہے۔ استاد منگو نے پچھلے برس کی لڑائی اور پہلی اپریل کے نئے قانون پر غور کرتے ہوئے گورے سے کہا ''کہاں جانا مانگتا ہے؟''۔

استاد منگو کے لہجے میں اس کے چابک جیسی تیزی تھی۔ گورے نے جواب دیا ''ہیرا منڈی''، ''کرایہ پانچ روپے ہوگا'' استاد منگو کی مونچھیں تھرتھرائیں۔ یہ سن کر گورا حیران رہ گیا۔ وہ چلّایا ''پانچ روپے۔ کیا تم .... ؟'' ''ہاں ہاں، پانچ روپے'' یہ کہتے ہوئے استاد منگو کا داہنا بالوں بھرا ہاتھ بھینچ کر ایک وزنی گھونسے کی شکل اختیار کر گیا۔ ''کیوں جاتے ہو یا بے کار باتیں بناؤ گے؟'' استاد منگو کا لہجہ زیادہ سخت ہو گیا۔ گورا پچھلے برس کے واقعے کو پیش نظر رکھ کر استاد منگو کے سینے کی چوڑائی کو نظر انداز کر چکا تھا۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی پھر کھجلا رہی تھی اور اپنی چھڑی سے استاد منگو کو تانگے پر سے نیچے اُترنے کا اشارہ کیا۔ بَید کی یہ پالش کی ہوئی پتلی چھڑی استاد منگو کی موٹی ران کے ساتھ دو تین مرتبہ چھوئی۔ اس نے

کھڑے کھڑے اوپر سے پست قد گورے کو دیکھا۔ گویا وہ اپنی نگاہوں کے وزن ہی سے اِسے پیس ڈالنا چاہتا ہے۔ پھر اس کا گھونسہ کمان میں سے تیر کی طرح سے اوپر کو اُٹھا اور چشم زدن میں گورے کی ٹھوڑی کے نیچے جم گیا۔ دھکّا دے کر اس نے گورے کو پَرے ہٹایا اور نیچے اُتر کر اسے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔

ششدر و متحیر گورے نے اِدھر اُدھر سمٹ کر استاد منگو کے گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ اس کے مخالف پر دیوانگی کی سی حالت طاری ہے اور اس کی آنکھوں میں سے شرارے برس رہے ہیں تو اس نے زور زور سے چلّانا شروع کر دیا۔ اس کی چیخ و پکار نے استاد منگو کی بانہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا۔ وہ گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ یہ کہتا جاتا تھا:

''پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں...... پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں.... اب ہمارا راج ہے بچّہ''۔ لوگ جمع ہو گئے اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو استاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔ استاد منگو ان دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کی چوڑی چھاتی پھولی ہوئی سانس کی وجہ سے اُوپر نیچے ہو رہی تھی۔ منہ سے جھاگ بہہ رہی تھی اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا:

''وہ دن گئے جب خلیل خاں فاختہ اُڑایا کرتے تھے اب نیا قانون ہے میاں .... نیا قانون''۔ اور بے چارہ گورا اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بے وقوفوں کی مانند کبھی استاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ہجوم کی طرف۔ استاد منگو کو پولیس کے دو سپاہی تھانے میں لے گئے، راستے میں اور تھانہ کے اندر کمرے میں وہ ''نیا قانون، نیا قانون'' چلّاتا رہا، مگر کسی نے ایک نہ سُنی۔

''نیا قانون، نیا قانون کیا بک رہے ہو؟ قانون وہی پُرانا ہے'' اور اس کو حوالات میں بند کر دیا۔

شرکائے محفل

کے کے کھلر : سیکٹر C، پاکٹ 8، فلیٹ نمبر 8338، وسنت کنج، نئی دہلی 110007، فون: 011-26892829

پروفیسر صادق: A.G, 1/47C وکاس پوری، نئی دہلی۔ 110018، فون: 09818776459

پروفیسر علی احمد فاطمی: A-229، نوکر تنج، الہ آباد۔ 211003، فون: 09415306239

نور شاہ: 14 لال دید کالونی، گوری پورہ لنک روڈ، پوسٹ سنت نگر راول پورہ، سری نگر 190005، فون: 09906771363

محمد ایوب واقف: فلیٹ نمبر ے، بی کوئین ایونیو بی ونگ، سیکٹر ۱۴، کوپر کھیرانے، نوی ممبئی 400709، فون: 9320690691

محمد اسلم پرویز: 16/3 صنوبر اپارٹمنٹ، بلاؤ پلی، کرلا (ویسٹ)، ممبئی 400070، فون: 07738940046

م۔ ناگ: روم نمبر 4، جیانا کیز کمپاؤنڈ، بوریولی (ویسٹ)، ممبئی 400092، فون: 09221747124

ڈاکٹر سید منیر محی الدین قادری: شعبۂ اردو، سری وینکٹیشورا یونیورسٹی، تروپتی 517502،

ڈاکٹر ظہیر محمد: صدر شعبۂ اُردو، مان مادھو کالج، وجے پور، ضلع مرزا پور، یوپی۔ 231303، فون: 09451621974

ڈاکٹر محمد تنظیم احمد کاظمی: نازش منزل، ہری ہر پور، پوسا۔ 848125، سمستی پور (بہار)، فون: 09470766273

منیر حسین خرہ: ملا بوچن، گمن، بڈگام، کشمیر۔ 193041، فون: 09906643060

اوسیکر شہناز بانو علی مظہر: شیرین کالونی، سلطان پورہ، عثمان آباد۔ 403501، فون: 09881414543

☆☆☆

○ منٹو، ماہ وسال کے آئینے میں ○
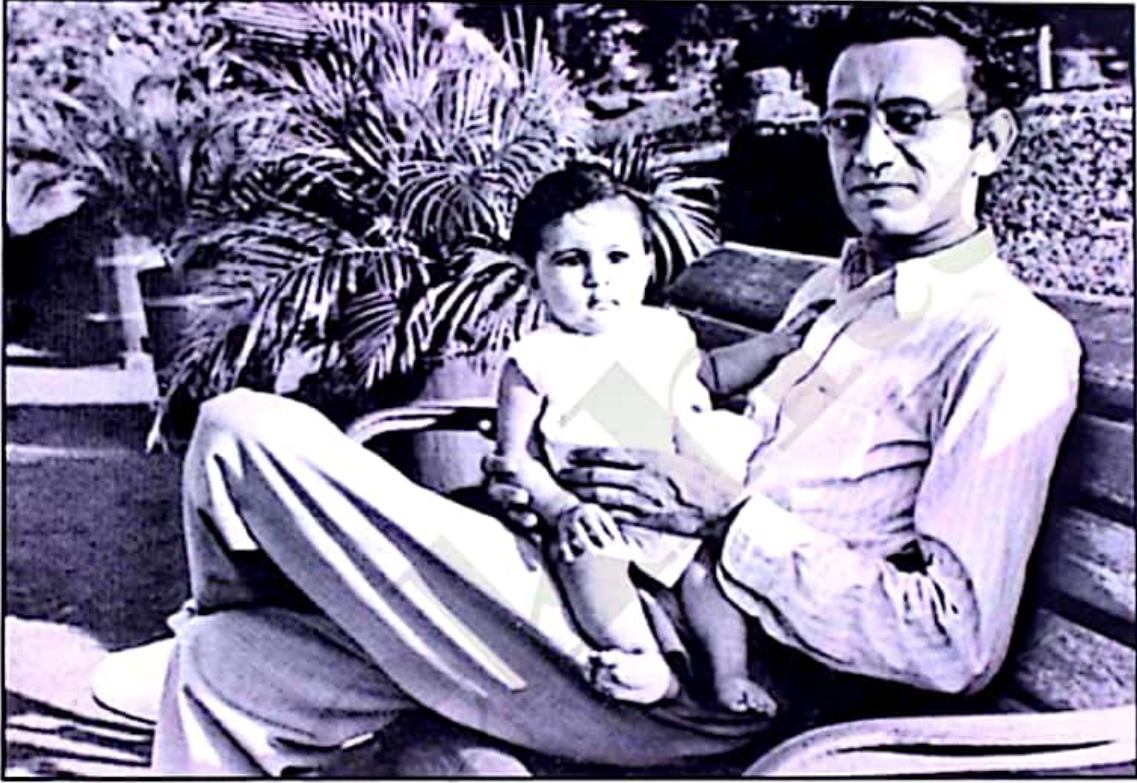
اپنی ننھی رکرن نزہت کے ساتھ
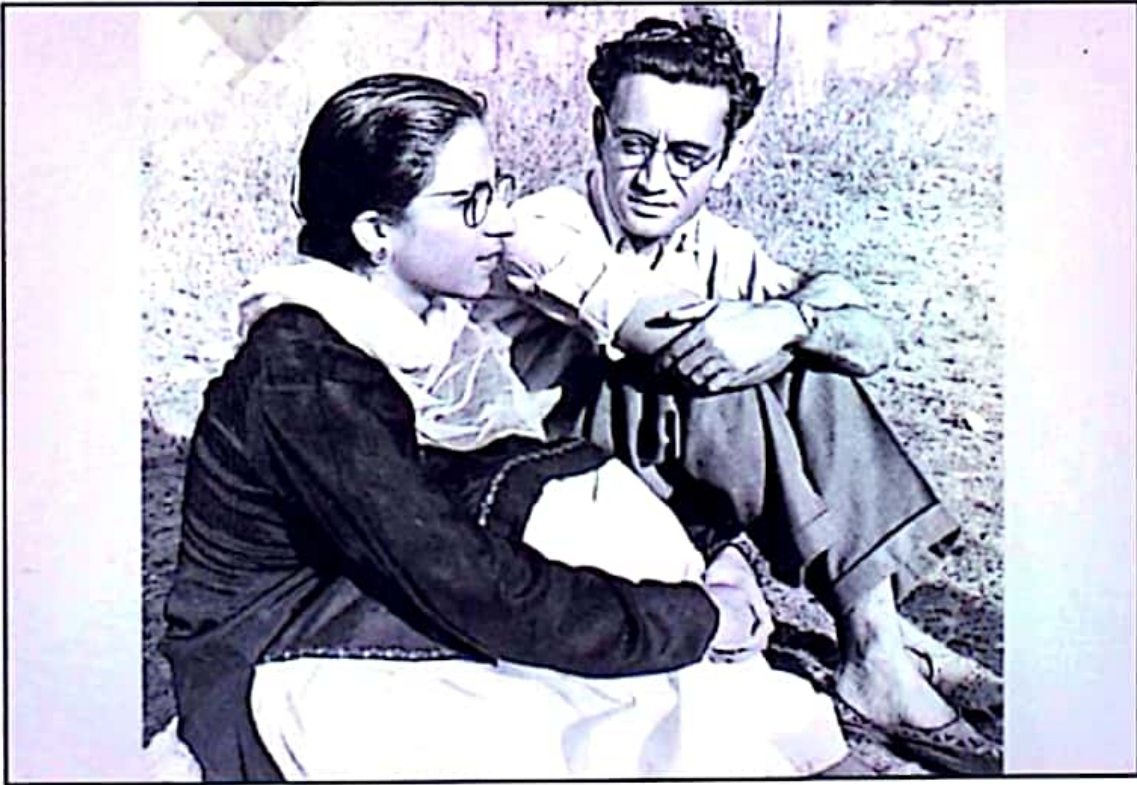
اپنی اہلیہ صفیہ کے ساتھ۔تم کو دیکھیں کہ تم سے بات کریں

........جو رہی سو بے خبری رہی

(دائیں سے) شوکت تھانوی، اے حمید، منٹو اور اشفاق احمد

غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

ہم انجمن سمجھتے ہیں، خلوت ہی کیوں نہ ہو

منٹو اپنے دوستوں کے ساتھ...... اور ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں

بچپن
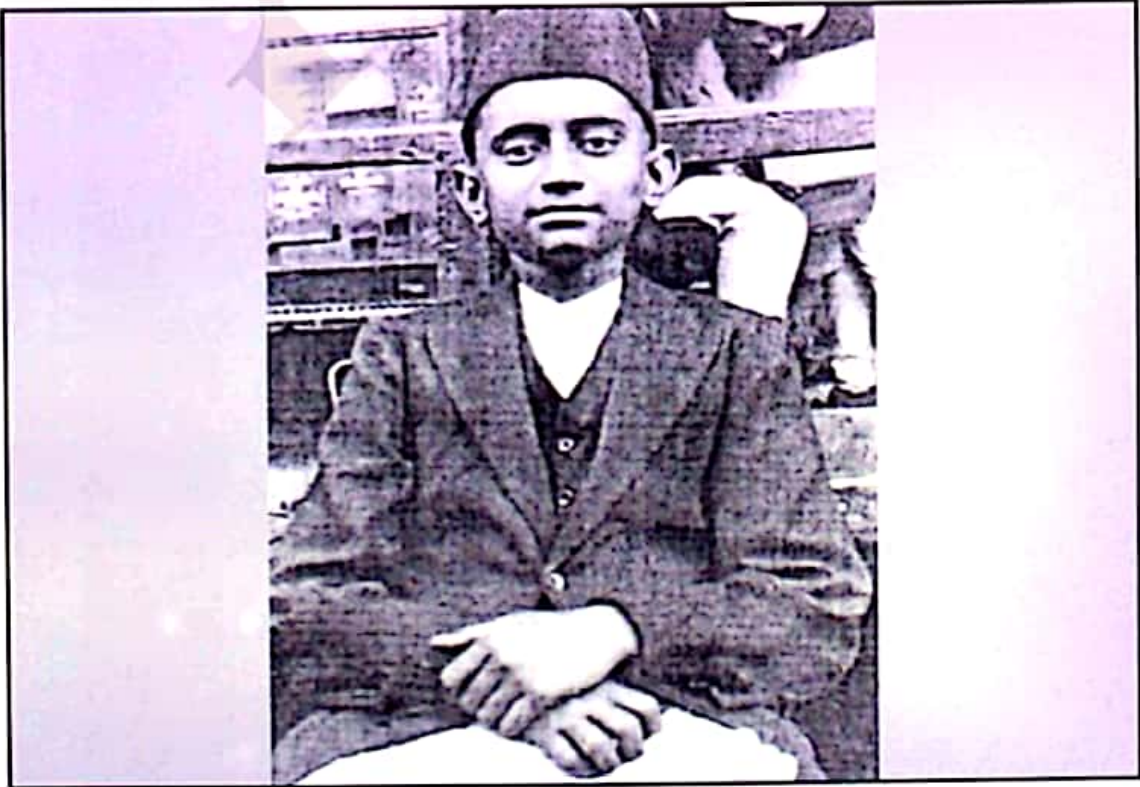
لڑکپن

منٹو اپنی بیگم صفیہ کے ساتھ۔ ہم چمن میں کیا گئے گویا دبستاں کھل گیا

چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

منٹو اور صفیہ اپنی لاڈلی کے ساتھ ، دل کی تمنا تھی مستی میں منزل سے بھی دور نکلتے
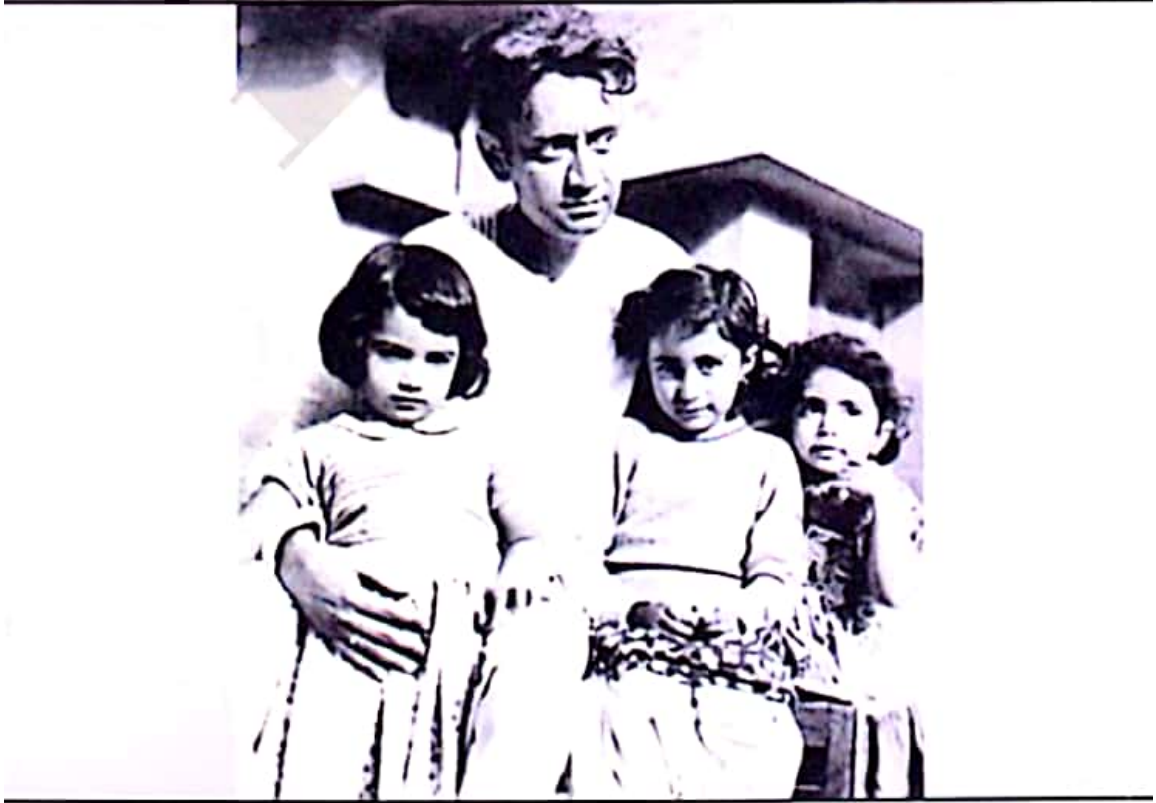
منٹو اپنی تینوں کلیاں نصرت ،نگہت اور نزہت کے ساتھ
مرے گلشن کی یہ کلیاں ہی میری ساری دولت ہیں

لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں
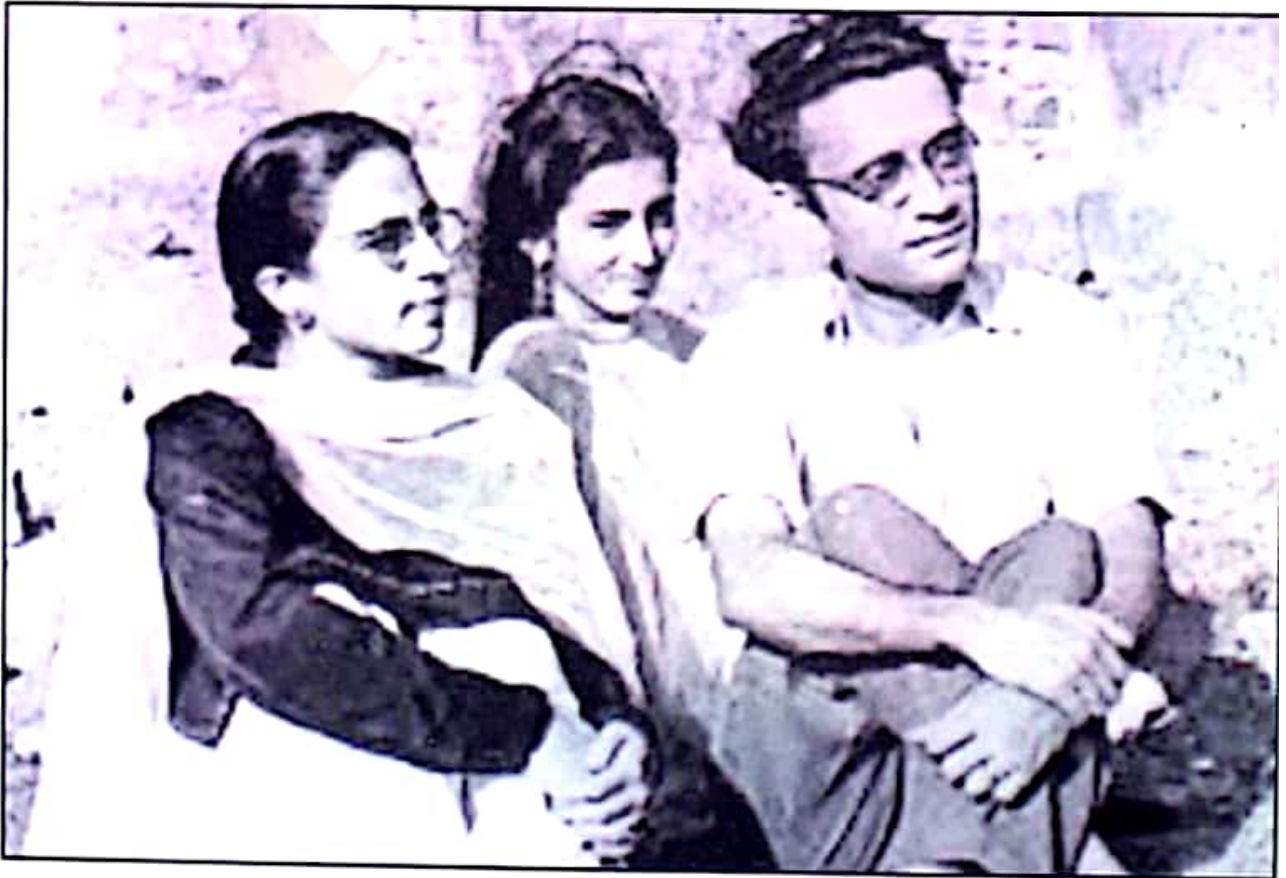
بس اک سکوت کا عالم جسے نوا کہیے
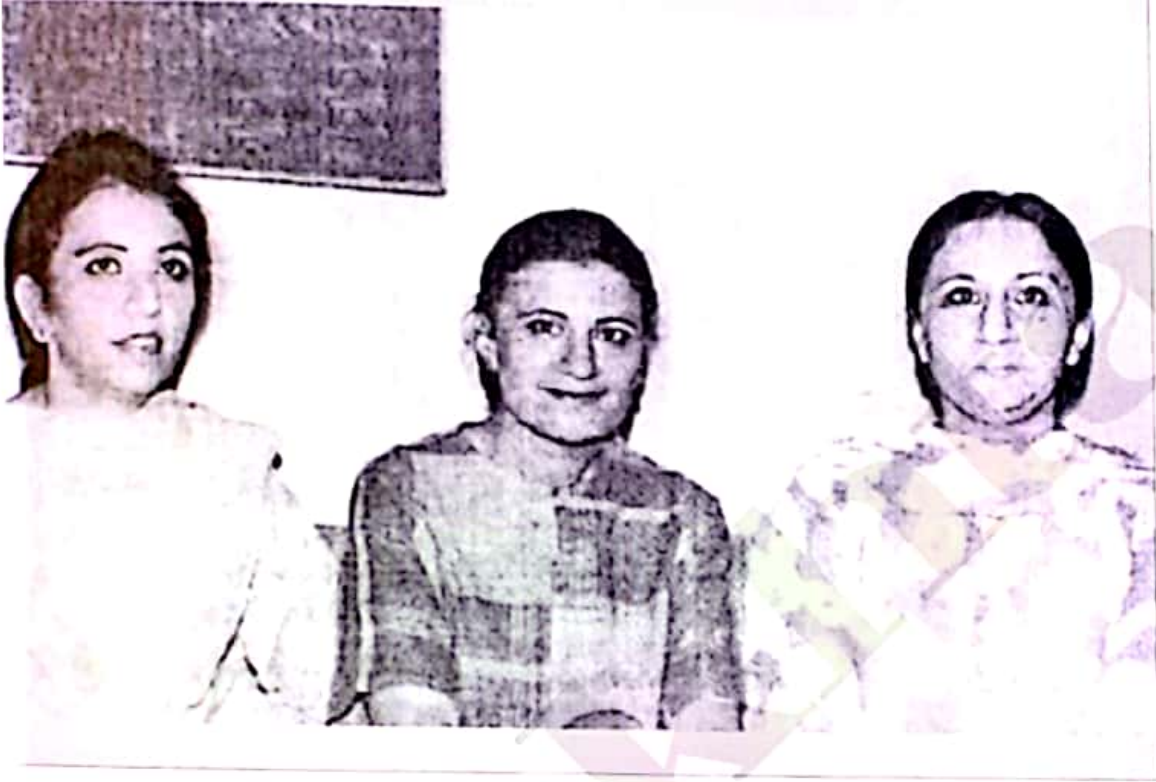
نزہت   نگہت   نصرت

ہمیں ہے فخر کہ ہم دخترانِ منٹو ہیں (۱۹۷۳ء)

مسز نزہت ارشد فاروق، مسز نگہت پٹیل، مسز نصرت شاہد جمال (۲۰۱۲ء)

منٹو مطبوعات

SAADAT HASAN MANTO
ASRE HAAZIR KAY AAINE MEIN

Compiled by : Mohammed Husain Parkar

منٹو معلومات

سعادت حسن منٹو کے والد خواجہ غلام حسن قوم اور ذات کے کشمیری، امرتسر کے ایک محلے کوچہ وکیلاں میں ایک بڑے خاندان کے ساتھ رہتے تھے۔ منٹو ۱۱رمئی ۱۹۱۲ء کو موضع سمبرالہ، ضلع لُدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد لُدھیانہ کی کسی تحصیل میں مامور تھے۔ ان کے دوست انہیں ٹامی کے نام سے پکارتے تھے۔ منٹو اپنے گھر میں ایک سہمے ہوئے بچے تھے۔ سوتیلے بہن بھائیوں کی موجودگی اور والد کی سختی کی وجہ سے اپنا حال کسی پر ظاہر نہ کر سکتے تھے۔
ان کی والدہ سردار بیگم ان کی طرفدار تھیں۔ وہ ابتدا ہی سے تعلیم کی طرف مائل نہیں تھے۔ میٹرک کے امتحان میں تین بار ناکام ہوئے۔ ۱۹۳۱ء میں چوتھی بار امتحان دیا تو کامیابی ملی۔ ایف اے کے امتحان میں بھی دو بار فیل ہوئے۔ تیسری بار ۱۹۳۵ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ ہوا لیکن صحت خراب ہوگئی اور پڑھائی ادھوری چھوڑ کر امرتسر چلے گئے۔ یہاں آ کر امرتسر سے ایک اخبار 'مساوات' میں کام کرنے لگے۔ جلد ہی آپ کو کرم چند کے اخبار 'پارس' لاہور میں چالیس روپے ماہوار کی ملازمت مل گئی۔ لیکن یہاں دو ڈھائی مہینے ہی کام کیا ہوگا اس کے بعد ممبئی (بمبئی) چلے گئے اور ہفت روزہ 'مصور' کی ادارت سے وابستہ ہو گئے۔ یہ سلسلہ دسمبر ۱۹۳۶ء سے اپریل ۱۹۳۷ء تک جاری رہا۔ یکم مئی ۱۹۳۷ء سے ۳۱رجولائی تک ہفت روزہ 'سماج' ممبئی کے مدیر رہے۔ اس کے بعد پھر 'مصور' سے متعلق ہو گئے۔ جنوری ۱۹۴۱ء سے ستمبر ۱۹۴۲ء تک آل انڈیا ریڈیو (دہلی) سے وابستہ رہے۔ اکتوبر ۱۹۴۲ء میں دوبارہ ممبئی پہنچے اور 'مصور' کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دِنوں تک نہ چل سکا۔ ۱۵راگست ۱۹۴۷ء سے ۳۱ردسمبر ۱۹۴۷ء تک ممبئی ٹاکیز لمیٹیڈ کی ملازمت کی۔ جنوری ۱۹۴۸ء میں لاہور چلے گئے۔ لاہور سے انہوں نے دو ماہی 'اُردو ادب' اور 'نگارش' نام سے رسالے نکالے لیکن یہ سلسلہ چل نہ سکا۔
۱۸رجنوری ۱۹۵۵ء بروز منگل لاہور ہی میں انتقال ہوا۔ ۲۰۱۲ء میں انہیں (پس از مرگ) پاکستان کا گراں قدر ایوارڈ 'نشانِ امتیاز' سے نوازا گیا۔

منٹو کی شخصیت کی تعمیر میں باری علیگ کا زبردست ہاتھ رہا ہے۔ منٹو کی ان سے ملاقات اپریل ۱۹۳۳ء میں ہوئی۔ ان دِنوں یہ بارہویں کلاس کے طالب علم تھے اور باری علیگ 'مساوات' امرتسر کے ایڈیٹر۔ انہوں نے ہی منٹو کو لکھنے پڑھنے کا شوق دِلایا۔ ان کی ابتدائی تحریریں 'مساوات' میں شائع کیں۔ پھر انہی کے تعلق سے وہ لاہور پہنچے اور اخبار 'پارس' لاہور میں ملازم ہوئے۔ منٹو کی شادی ۲۶راپریل ۱۹۳۹ء کو ایک کشمیری خاندان میں صفیہ بنت خواجہ قمرالدین سے ہوئی۔ ان کے ایک ہی بیٹا تھا، اس کا نام عارف تھا۔ وہ زمانہ طفولیت ہی میں فوت ہوگیا۔ بیٹیاں: نگہت (مسز نگہت پٹیل)، نُزہت (مسز نُزہت ارشد فاروق) نُصرت (مسز نصرت شاہد جمال)۔ تینوں بیٹیاں ماشاء اللہ بقیدِ حیات ہیں۔ پہلا طبع زاد افسانہ 'تماشا' ہفت روزہ 'خلق' اگست ۱۹۳۴ء کے شمارے میں چھپا۔ منٹو کے ہم جماعت میں اسرارالحق مجاز، علی سردار جعفری، معین احسن جذبی، جاں نثار اختر اور قریبی دوستوں میں خواجہ حسن عباس، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، ن م راشد، میراجی، عصمت چغتائی، اوپندر ناتھ اشک، دیوندر ستیارتھی اور غلام حیدر کے نام نمایاں ہیں۔

HINDUSTANI PRACHAR SABHA
Mahatma Gandhi Memorial Building,
7-Netaji Subhash Road, Mumbai-400 002
Tel.: 22812871, 22810126
email:hp.sabha@gmail.com